اللہ اکبر

عالیجناب نواب غلام احمد خاں صاحب مرحوم و مغفور المتخلص بہ احمدی رئیس کنج پورہ ضلع کرنال

سابق ممبر کونسل آف ریجنسی ریاست گوالیار کی

سوانح عمری

موسومہ
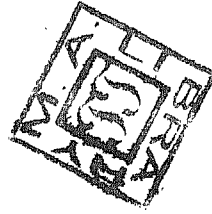
حیات احمدی

مرتبہ

صاحبزادہ سردار سلطان احمد خاں سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ایم

بیرسٹر ایٹ لا پولیٹیکل ممبر ریاست گوالیار مدظلہ

و

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بی۔ اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا سابق وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مرحوم

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

محمد احمید الدین پرنٹر

URDU SECTION
۳۶۳۰۷
MAULANA AZAD LIBRARY, ALIGARH, M.U.
29 APR 1970
AZAD LIBRARY A.M.U.

فہرست مضامین حیات احمدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی مرحوم جن کی زندگی کے مختصر حالات ذیل کے صفحات میں درج کیے جاتے ہیں اور جن کی متعدد تصانیف کا انتخاب اب یکجائی شایع کیا جاتا ہی ہم دونوں بھائیوں کے والد ماجد تھے۔

۱۶ اپریل سنہ ۱۹ء کو بمقام علی گڈھ ان کا انتقال ہوا جس کو پچیس ۲۵ سال کا عرصہ گزر چکا ہم کو سخت ندامت ہی کہ جو کام ان کی رحلت کے فوراً بعد ہونا چاہیئے تھا اُس کی انجام دہی میں اس قدر دیر ہوئی۔ افسوس اور شرمندگی ہم کو نہ صرف اس وجہ سے ہی کہ ایک فرض کی ادائگی میں اس قدر توقف ہوا بلکہ اس سبب سے اور بھی زیادہ ہی کہ ایک نہایت مفید اور کامیاب زندگی جو بہت کچھ قوم اور پبلک کے لیئے قابل نمونہ تھی اُس کے حالات کی تحریر اور اشاعت میں اس قدر تساہل سرزد ہوا۔ اس اقبال خطا کے بعد اب ہم اپنے "ابا جان" کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات اختصار کے ساتھ ذیل کے صفحات میں درج کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ مرحوم کی ذات صفات اور شخصیت کس درجہ اور پایہ کی تھی اور آئندہ نسلوں کو

اُن سے کیا اور کس قسم کا سبق حاصل ہو سکتا ہے اس سوانح عمری کا نام "حیات احمدی" اس لیئے رکھا گیا کہ "احمدی" مرحوم کا تخلص تھا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ اول حصہ میں سوانح عمری ہے جس میں مرحوم کی مشہور تصنیف صبح نور کے کچھ اقتباسات بھی ہیں۔ دوسرے حصے میں مرحوم کی دوسری تصانیف پر مختصر تبصرہ ہے اور ان کے اقتباسات ہیں۔ یہ مجموعہ اب پہلی مرتبہ شایع ہوتا ہے اور اُمید ہے کہ مفید ثابت ہو گا۔

سلطان احمد خاں
آفتاب احمد خاں

۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء

کتب خانہ حامدیہ
ریاست [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیات احمدی

حصّہ اوّل

پہلا باب

ابتدائی حالات

مختصر خاندانی حالات نواب غلام احمد خاں صاحب مرحوم خاندان کنجپورہ کے ایک ممتاز اور کامیاب رکن تھے۔ کنجپورہ، ضلع کرنال، صوبہ پنجاب میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کی بنا اٹھارھویں صدی عیسوی میں نواب نجابت خاں مرحوم نے ڈالی تھی اور جو اس وقت تک اُن کے خاندان میں موجود ہے۔

خاندان کنجپورہ کی گزشتہ تاریخ نواب نجابت خاں مرحوم اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ غور غشت کے رہنے والے کاکڑ زئی پٹھان تھے۔ ابتدا عمر سے آزاد منش اور دل چلے تھے سنہ ۱۷۲۰ء کے قریب اپنے عزیزوں سے کسی وجہ سے ناراض ہو کر ترک وطن کر کے پنجاب چلے آئے اور کچھ زمانہ تک ملتان اور لاہور میں شاہی صوبہ دار کی ملازمت میں رہے۔ کچھ عرصہ میں تین سو سواروں کے سپہ سالار ہو کر لاہور سے ضلع کرنال گئے۔ وہ زمانہ رنگیلے محمد شاہ بادشاہ کا تھا جبکہ کل ملک میں طوائف الملوکی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ نجابت خاں صاحب جیسے اولوالعزم طبیعت کے شخص

کے لیئے موقعہ تھا چنانچہ اُنھوں نے ضلع کرنال کے ایک حصہ پر قبضہ کرکے اُس مقام پر ڈیرے ڈالدیئے جہاں کہ اب کنجپورہ آباد ہی۔ یہ مقام شہر کرنال سے مشرق کی طرف سات میل کے فاصلہ پر واقع ہی۔ کسی زمانہ میں یہاں جمنا بہتی تھی اور گو اب جمنا یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر مشرق کی طرف جاری ہی لیکن پُرانی جگہ بھی ایک نالہ موجود ہی جو "پوران" کے نام سے مشہور رہی۔ اس نالے میں کونجیں بسیرا کیا کرتی تھیں اس لیئے گو ابتدا میں نئی بستی کا نام نجابت گڑھ رکھا گیا تھا لیکن اس کا نام کنجپورہ مشہور ہوگیا۔

نجابت خاں نے کنجپورہ کو مرکز قرار دے کر قرب وجوار کے دیہات پر تقریبًا چالیس میل تک قبضہ کرلیا۔ کنجپورہ کو ایک پختہ قلعہ کی شکل میں آباد کیا اور اُس کے چہار طرف نہایت مضبوط، بلند اور پختہ فصیل معہ ایک چوڑی اور گہری خندق کے تعمیر کی فصیل کے قریب سب طرف پٹھانوں کو آباد کیا اور اندر کی طرف دوسرے لوگوں کو بسایا کیونکہ اُس زمانہ میں برابر لڑائیاں رہتی تھیں اور جو علاقہ فتح کیا تھا اُس کی حفاظت کے لیئے ہر وقت تیار اور مسلح رہنا پڑتا تھا اور چونکہ لڑنے کی خدمت پٹھانوں کے سپرد تھی اس لیئے سب کی حفاظت کے لیئے وہ فصیل کے قریب آباد کیئے گئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ دہلی کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو صوبہ سہارنپور کو دہلی سے حکم ہوا کہ وہ کنجپورہ پر فوج کشی کرکے تدارک کرے چنانچہ شاہی فوج اور نجابت خاں کے لشکر میں دریائے جمنا کے کنارہ پر مقابلہ ہوا۔ جرّار پٹھانوں نے شکستہ حال شاہی سپاہیوں کو بہ آسانی پسپا کرکے بھگا دیا اور فتح یاب ہوئے اور نجابت خاں کامیابی کے ساتھ کنجپورہ اور گرد نواح کے علاقہ پر قابض رہے بعد اور واقعات کے آخرکار شاہ دہلی نے نجابت خاں کو نوابی کا خطاب دے کر ریاست مقبوضہ پر پورے اختیارات کے ساتھ بحال کردیا۔ ۱۷۶۰ء میں آخری جنگ پانی پت سے پیشتر وسواس راؤ بھاؤ مرہٹے نے کنجپورہ پر حملہ کیا۔ گو نجابت خاں کی جمعیت مرہٹوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی تاہم پٹھان خوب لڑے۔ کہا جاتا ہی کہ ہماری والدہ مرحومہ کے پرنانا شادی خاں صاحب مرحوم جو نجابت خاں کے بھانجے تھے وہ لڑتے لڑتے تلوار سے ایسے زخمی ہوئے کہ اُن کے پیٹ کی آنتیں باہر نکل آئیں لیکن وہ اپنے عمامہ سے پیٹ کو باندھ کر لڑتے رہے اور دس مرہٹوں کو مار کر شہید ہوئے۔ مگر چونکہ بھاؤ کی

فوج ایک لاکھ کے قریب تھی اور نجابت خاں کے لشکر میں صرف چند ہزار پٹھان تھے۔ بھاؤ نجابت خاں صاحب کو قید کرکے پانی پت تک لے گیا اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ اس عرصہ میں نجابت خاں کے بڑے بیٹے دلیر خاں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہوکر پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کے خلاف لڑے اور احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر فتح پانے کے بعد دلیر خاں کو نجابت خاں کی جگہ ریاست کنجپورہ کی گدی پر بٹھلایا۔ غرضکہ اُس زمانہ میں دہلی کے قرب و جوار میں جو تاریخی انقلابات ہو رہے تھے اُن میں خاندان کنجپورہ کا خاص حصّہ تھا۔ اُس کے بعد مدّت تک والئے کنجپورہ کو پورا عروج اور کامل اختیارات حاصل رہے ۱۸۰۸ء میں جب انگریزی فتوحات ستلج تک پہونچیں تو اُس وقت کنجپورہ پنجاب کی چھ اعلےٰ ریاستوں میں شمار ہوتا تھا لیکن اُس کے بعد زوال شروع ہوا۔ نصف صدی سے زیادہ ریاست کرنے سے اراکین خاندان عیش طلب اور پست ہمت ہو چکے تھے اس لیئے جب قرب و جوار کے سکھوں سے جھگڑے شروع ہوئے تو کنجپورہ کا بہت سا علاقہ نکل گیا اور گو ریاست کی عزّت و شان کچھ باقی رہی لیکن آمدنی بہت کم ہوگئی یہاں تک کہ اب رئیس موجودہ کی تقریباً سوا لاکھ روپیہ کی آمدنی رہ گئی ہو۔ خاندان کنجپورہ کے حالات تفصیل کے ساتھ کرنل میسی کی مشہور کتاب "فیملیز آف نوٹ اِن دی پنجاب" Families of note in the Punjab by Colonel Massey میں جس میں پنجاب کے مستند خاندانوں کے حالات گورنمنٹ کے ایما سے لکھے گئے ہیں بیان ہوئے ہیں۔ اس سوانح عمری میں صرف اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہو۔ والد مرحوم نے اپنی کتاب ہفت روز کے آخر میں اپنے خاندان کا ذکر ذیل کے اشعار میں کیا ہو:-

اگر کنجپورہ کو کہوں میں چمن — تو میں اُس کا ہوں بلبلِ نعرہ زن
میرے جدِ اعلیٰ معلےٰ خطاب — نجابت خاں نواب والا جناب
قدیمی وطن ان کا غرغشت ہو — میری اُن سے اب پانچویں پشت ہو
ہوا واں سے یاں آکے فرماں روا — اُسی سے پڑی کنجپورہ کی بِنا

ہوا یاں کا اول وہی حکمراں	اُسی سے معزز ہوا خاندان
جوار عنایت میں دے اُس کو جا	گلستانِ فردوس میں کبریا

نواب نجابت خاں کے سات بیٹے ہوئے، جن میں ایک محمد اختیار خاں تھے۔ اختیار خاں کی اولاد میں ہمارے والد نواب غلام احمد خاں کی پانچویں پشت تھی جیسا کہ ذیل کے شجرے سے ظاہر ہے:۔

۱۔ نجابت خاں

۲۔ اختیار خاں

۳۔ سلطان خاں عرف جھبو خاں

۴۔ محمد نور خاں

۵۔ غلام احمد خاں

ولادت اور اوائل عمر کے حالات نواب غلام احمد خاں یکم جنوری ۱۸۳۹ء بروز عید الفطر بمقام کنجپورہ پیدا ہوئے۔ چونکہ محمد اختیار خاں صاحب نواب نجابت خاں کے چھوٹے بیٹے تھے اس لیے جاگیر کے چند مواضعات ان کو ملے تھے مگر اُن کے بیٹے سلطان خاں عرف جھبو خاں سے گدی نشین رئیس نے یہ سب دیہات لے لیے۔ چنانچہ جب والد مرحوم پیدا ہوئے تو ہمارے خاندان کی شاخ کے پاس ہماری خوش نصیبی سے کوئی جاگیر نہ تھی اور نہ ریاست سے کسی قسم کا گزارہ مقرر تھا۔ ہماری خوش نصیبی اس لیے کہ جس طرح ہمارے خاندان اور دیگر پُرانے خاندانوں کے حالات سے ظاہر ہے اس قسم کی جاگیریں اور گزارے نسلاً بعد نسل تقسیم ہوتے ہوتے اس قدر قلیل رہ جاتے ہیں کہ شریفانہ بسر اوقات کے لیے تو کافی نہیں ہوتے لیکن ان کے سبب سے ریاست کی بو دماغوں میں سما جاتی ہے وہ فکر معاش کی جد و جہد کے لیے سد راہ ہو جاتی ہے چنانچہ ہمارے خاندان میں اس وقت اُن شاخوں کی نسلیں جن کے پاس جاگیر اور گزارے تھے سخت نکبت اور افلاس کی حالت میں ہیں مگر گھر سے باہر نکلنا اور کسب معاش کے لیے خود کچھ کرنا ان کے لیے

نہایت محبوب ہے۔ اللہ جل جلالہٗ کا ہم پر یہ خاص احسان ہوا کہ جب والد مرحوم پیدا ہوئے تو اُن کی فطری اولوالعزمی کے رستے میں کسی جاگیر یا گذارے کی رکاوٹ نہ تھی۔ اُن کے والد محمد نور خاں صاحب مرحوم اول نواب کنجپورہ کے اور اُس کے بعد ریاست کپورتھلہ میں ملازم رہے۔ مگر والد مرحوم کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی جبکہ دادا صاحب نے بعارضہ ہیضہ انتقال کیا چونکہ بچے کم عمر تھے اس لیے تمام گھرانے کی پرورش اور نگرانی دادی صاحبہ مرحومہ کو کرنا پڑی۔ اس وقت والد مرحوم کے ایک بڑے اور دو چھوٹے بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ چونکہ کوئی جاگیر یا گزارہ نہ تھا اس لیے بچوں کی پرورش، تربیت اور تعلیم کا بار کم نہ تھا لہذا والد مرحوم کی تعلیم کے لیے اُن کی فطری ذہانت اور ذکاوت کے مطابق تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا۔ جہاں تک کہ تعلیم کا تعلق تھا اُس زمانہ میں ہمارے قصبہ میں چند میانجی اور ملاؤں کے ذریعہ سے قرآن شریف دینیات کی کتابوں اور اردو فارسی کا درس ہوتا تھا اور بدقسمتی سے پٹھان خاندانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس ہاتھ میں قلم ہو وہ تلوار نہیں اُٹھا سکتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اعلےٰ درجہ کی قدرتی ذہانتوں اور حصول علم کی صلاحیتوں کے ہمارے خاندان میں ذوق علم کم ہو گیا تھا۔ نوجوانوں کا زیادہ تر وقت گھوڑے کی سواری گتکا پھری اور دوسری سپاہیانہ ورزشوں میں صرف ہوتا تھا۔ البتہ جن طبیعتوں میں علمی شوق فطرتاً زیادہ ہوتا تھا وہ اس ماحول میں بھی حصول علم میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہمارے دادا صاحب کے بڑے بھائی احمد خاں صاحب عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ عربی اور فارسی کی کتابوں پر اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی اس وقت تک موجود ہیں۔ مگر عام طور پر خاندان اور بستی میں علمی چرچے بہت کم تھے تاہم باوجود ایسی ناموافق حالتوں کے والد مرحوم کو ابتدائے عمر سے حصول علم کا نہایت شوق تھا درحقیقت یہ ہے کہ جو علم انھوں نے حاصل کیا وہ محض اپنی طبیعت کی صلاحیت اور زور سے کیا۔ فطرت سے انھوں نے طبع موزوں پائی تھی اور چھوٹی ہی عمر سے شعر و شاعری کا اُن کو شوق تھا، چنانچہ دس سال کی عمر میں اُنھوں نے نظم میں ایک چھوٹی سی کتاب "قصہ کرشن" لکھی جس کا ذکر آئندہ ان کی تصانیف کے سلسلہ میں کیا جائیگا

بہر حال جہاں تک کہ اُردو اور فارسی کی تعلیم ہمارے وطن میں اُس وقت حاصل ہوسکتی تھی اُس کی تکمیل ابتدائے عمر میں اُنھوں نے اپنے شوق سے کی۔ اُس کے بعد عربی اور طب ٹونک میں وہاں کے علما اور حکیم امام الدین خاں صاحب سے پڑھی۔

دوسرا باب

سرکاری خدمات

ابتدائے عمر میں کسب معاش کے لیے جد و جہد جیسا کہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے ہمارے خاندان کی شاخ کے پاس والد مرحوم کے دادا کے وقت سے کوئی جاگیر یا گزارہ نہیں تھا۔ اس لیے کسب معاش کی ضرورت کی وجہ سے والد مرحوم اپنی تعلیم کے سلسلہ کو زیادہ جاری نہ رکھ سکے۔ ان کی عمر صرف پندرہ سولہ سال کی تھی جبکہ وہ انگریزی رسالہ میں ملازم ہوگئے جہاں اُن کے بڑے بھائی اور دوسرے رشتہ دار پیشتر سے مختلف عہدوں پر مامور تھے۔ فوج میں ملازمت کو سال ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوگیا۔ والد مرحوم کی زندگی کا یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ غدر سے دو تین ہفتے پیشتر ایک فقیر اُن کو ملا جس نے کہا کہ تم فوج کی نوکری فوراً چھوڑ دو۔ اُنھوں نے وجہ دریافت کی مگر اُس نے کہا کہ وجہ نہ پوچھو جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرو۔ چنانچہ والد مرحوم کے دل پر اس فقیر کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ اُنھوں نے باوجود اپنے بڑے بھائی صاحب اور دوسرے رشتہ داروں کے منع کرنے کے اُسی روز استعفا دے دیا اور گو فوج کے کرنل نے چند مرتبہ اُن کا استعفا واپس کیا لیکن والد نے نہ مانا اور ملازمت ترک کرکے وطن چلے آئے۔ اُس کے چند ہی روز بعد غدر کا ہنگامہ ہوگیا جس میں اُن کے بڑے بھائی اور متعدد رشتہ دار مارے گئے۔

نواب صاحب کنجپورہ کی ملازمت فوج کی ملازمت ترک کرنے کے بعد سات آٹھ سال تک

والد مرحوم کی زندگی سخت کشمکش اور فکر و پریشانی میں گزری۔ سولہ برس کی عمر میں اُن کی شادی ہو چکی تھی اور خانہ داری کی ذمہ داریاں اُن پر عائد ہو چکی تھیں۔ اس زمانہ میں قحط بھی سخت پڑا تھا ان وجوہ سے اُن کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اول اُنھوں نے گھوڑوں کی تجارت کی اُس کے بعد نواب صاحب کنجپورہ کی ملازمت میں کچھ دن گزارے لیکن چونکہ طبیعت میں اولوالعزمی اور حوصلہ مندی تھی اس لیئے کنجپورہ کے محدود دائرہ میں زیادہ مدت نہ رہ سکے اور تلاش روزگار کے لیئے راجپوتانہ کا سفر کیا اور ٹونک تشریف لے گئے لیکن اُس وقت وہاں ملازمت کا کوئی سلسلہ نہ ہوا اور کنجپورہ واپس آنا پڑا۔ واپسی پر پھر نواب صاحب کنجپورہ کی ملازمت کی مگر پھر طبیعت کو چین نہ ملا اور باوجود ہر ایک قسم کی بے سروسامانی کے پھر ٹونک کا سفر کیا۔ اُس زمانہ میں جن جن مشکلات کا اُنھوں نے مقابلہ کیا اور جس قسم کی تکالیف اُنھوں نے برداشت کیں اُن کا اکثر ہم سے ذکر فرمایا کرتے تھے کنجپورہ سے ٹونک جاتے ہوئے بارہا اُنھوں میلوں تک پیدل سفر کیا لیکن اسی کے ساتھ اپنی شان اور آن بان کا ہمیشہ خیال رکھا۔ چنانچہ جب کوئی بڑا شہر یا قصبہ راستہ میں آتا تو وہاں سواری میں داخل ہوتے اور باوجود اس بے سروسامانی اور پریشانی کے کبھی کسی کے ممنون احسان نہیں ہوئے۔

ٹونک کا تعلق ۱۸۶۳ء میں جب دوسری مرتبہ ٹونک گئے اُس وقت وہاں ملازم ہوئے۔ اوّل کچھ دن صاحبزادہ عبادالله خاں صاحب کا کام کیا اور پھر ریاست میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے ۱۸۶۷ء تک ریاست میں مختلف فرایض انجام دیئے۔ گو عمر کم تھی مگر اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے ریاست میں اُن کو خاص امتیاز حاصل رہا محکمہ خاص، محکمہ اپیل محکمہ شریعت اور ضلع ٹونک کے انتظام کی پوری ذمہ داری اُن کے سپرد رہی۔ ریاست کے انتظام کے لیئے مختلف قوانین اُنھوں نے وضع کیئے اور ریاست ٹونک کی تاریخ "گلستان ابراہیم" کے نام سے لکھی۔ غرضکہ تقریبًا دس سال تک ریاست ٹونک میں نواب صاحب کے مشیران خاص میں اور ریاست کے اعلیٰ عہدہ داروں میں رہے۔ ۱۸۷۴ء میں ریاست ٹونک سے قطع تعلق کر کے

اپنے وطن تشریف لے آئے۔

وطن کا عارضی قیام ٹونک چھوڑنے کے بعد دو سال تک مرحوم نے اپنے وطن میں قیام کیا۔ یہ زمانہ علمی مشاغل تصنیف اور ملکی معاملات اور مصالح کے مطالعہ میں گذرا۔ چنانچہ انھیں دنوں میں اُنھوں نے روس اور افغانستان کے معاملات کی نسبت گورنمنٹ ہند کو چند اہم مشورے دیے۔ اُنھوں نے رائے دی تھی کہ امیر عبدالرحمن خاں کو روس کے اثر میں رہنے دینا مناسب نہیں۔ ان مشوروں کے اعتراف میں گورنمنٹ ہند نے بذریعہ چٹھی نمبری ۲۱۳۴ مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۸۸۴ء اُن کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ اُسی زمانہ میں اُنھوں نے کتاب "ہفت روز" لکھی جس کا ذکر بعد کو ہوگا اور جو فروری ۱۸۸۶ء میں دربار لاہور میں ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلس کو پیش ہو کر قبول ہوئی۔

ریاست گوالیار کی ملازمت اپریل ۱۸۸۶ء میں والد مرحوم گوالیار تشریف لے گئے وہ زمانہ جیاجی راؤ مہاراج کی حکومت کا تھا اور دادا کھر کے دیوان ریاست تھے۔ دیوان صاحب سے والد ملے اور چند ہی روز کے قیام کے بعد وہاں ملازم ہو گئے۔ اول دو سال تک دیوانی دربار میں اسسٹنٹ رہے۔ ۱۸۸۸ء میں ضلع عیسے گڑھ کا انتظام اُن کے سپرد ہوا۔ آٹھ سال تک اُس ضلع کی صوبات پر مامور رہے۔ جس خوبی اور کامیابی سے اس ضلع کا انتظام کیا آج تک وہاں کی رعایا نہایت احسانمندی کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ ان کے عہد سے پیشتر وہاں کا حال یہ تھا کہ روزانہ ڈاکے پڑتے تھے، رشوت کا بازار گرم تھا جس کے سبب سے رعایا سخت نالاں تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اُنھوں نے امن قایم کر دی، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا۔ ہم کو یاد ہے کہ راتوں کو جب کبھی اُن کو اطلاع ملتی کہ ان کے علاقہ میں کہیں ڈاکہ پڑا تو اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر خود موقعہ پر جاتے تھے۔ اُن کی مستعدی، بے لوث انصاف اور رعایا پروری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بدمعاش اور ڈاکو گرفتار کیے گئے اور سزایاب ہوئے۔ بہت سے از خود حاضر ہو گئے اور خوش چلنی اور امن کی زندگی اختیار کی۔ علاوہ جان و مال کے تحفظ کے اُنھوں نے صیغہ مال کے

انتظام میں بہت ترقی اور درستی کی امن و امان قایم رکھنے اور حالت علاقہ کو ترقی دینے کے لیئے ہر سال وہ پانچ ماہ کل ضلع کا دورہ کیا کرتے تھے۔ زمینداروں اور کسانوں کو زراعت کے اصول اور جدید طریقے ترقی پیداوار کے سکھلاتے اور دوسرے سال کے دورہ میں جاکر اُس کی جانچ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں بیگھے نیا رقبہ آباد ہوگیا اور کل علاقہ میں ترقی اور خوش حالی کے آثار نمودار ہوگئے۔ ہر سال ایک مفصل رپورٹ اپنے ضلع کے انتظامات اور حالات کی بابتہ دربار کو بھیجتے تھے جس میں تمام اصلاحات اور ترقیوں کی تفصیل ہوتی تھی۔

کونسل آف ریجنسی کی ممبری اور تعلیم کی توسیع و اشاعت

۱۸۸۶ء کے وسط میں ہز ہائی نس مہاراجہ جیاجی راؤ صاحب بالقابہ کا انتقال ہوا اور چونکہ اُس وقت ولیعہد نابالغ تھے اس لیئے نابالغی کے زمانہ میں انتظام کے لیئے کونسل آف ریجنسی قایم ہوئی جس میں والد مرحوم مسلمان ممبر مقرر ہوئے اور یکم ستمبر ۱۸۸۶ء سے وہ اس عہدہ پر مامور ہوئے۔ کونسل کی ممبری کے زمانہ میں مختلف صیغے اُن کے سپرد رہے۔ اوّل صیغہ پولیس اُن کے تحت میں رہا جس کی بہت کچھ صلاح اُنھوں نے کی بسنہ ۱۸۸۸ء میں محکمہ تعلیم اُن کی نگرانی میں دیا گیا۔ اُس وقت تک ریاست میں انتظام تعلیم برائے نام تھا۔ ادنیٰ درجہ کے صرف ۹۷ اسکول تھے جن میں ہندی، فارسی اور مرہٹی پڑھائی جاتی تھی۔ صرف شہر لشکر میں جو ریاست کا صدر مقام تھا ایک مڈل اسکول کے درجہ کا مدرسہ تھا جس میں انگریزی کی تعلیم ہوتی تھی۔ کسی مدرسہ میں مقررہ نصاب نہ تھا۔ تربیت اور ورزش جسمانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ صیغہ تعلیم کے لیئے کوئی ضابطہ نہ تھا نہ کسی مدرسہ میں کوئی طالب علم کسی پبلک امتحان کے لیئے تیار کیا جاتا تھا۔ والد مرحوم کی نگرانی شروع ہوتے ہی حالت بدل گئی۔ ضابطہ تعلیم مرتب کیا گیا۔ لائق اور سند یافتہ اُستاد مقرر کیئے گئے۔ یونیورسٹی کے امتحانوں کے لیئے طلبا تیار ہوکر بھیجے جانے لگے۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۲ء تک نوبت بہ نوبت مڈل اسکول سے بی۔ اے تک کی تعلیم ہونے لگی۔ دو کالج ایک لشکر میں ایک اُجین میں قایم ہوئے۔ غرضکہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہر ایک شاخ تعلیم میں ترقی شروع ہوگئی یہاں تک کہ سات سال

ڈو کالج ۱۶ مڈل اسکول ۱۹ اپر پرائمری اسکول اور ۶۹ ۴ پرائمری اسکول ریاست میں قائم ہو گئے ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۳ء تک ۱۰۸۷ طلبا مختلف پبلک امتحانوں میں شریک ہو کر ۴۴۳ بحساب پچاس فی صدی کامیاب ہوئے۔ دماغی ترقی کے ساتھ جسمانی تربیت پر بھی پوری توجہ کی گئی بڑے مدارس میں کرکٹ اور جمناسٹک وغیرہ کی ضروریات بہم پہونچائی گئیں اور سب جگہ جسمانی ورزش کا اہتمام کیا گیا۔

صنعتی تعلیم کے رواج کی کوشش

۱۸۹۱ء میں والد مرحوم نے بمبئی الہ آباد، لاہور اور رڑکی جاکر وہاں کے ٹیکنکل مدارس کو دیکھا تاکہ ریاست میں اس قسم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ وہاں سے واپسی پر گوالیار سے طلبا صنعت و حرفت کی تعلیم کے لیے میو اسکول آف آرٹ لاہور کو بھیجا تاکہ اُن کی تعلیم کی تکمیل ہونے پر ریاست میں صنعت و حرفت کے مدارس جاری کیے جا سکیں۔ غرضکہ والد مرحوم کی خاص توجہ اور کوشش سے چند ہی سال کے عرصہ میں باشندگان ریاست کی ہر قسم کی دماغی اور جسمانی نشوونما و ترقی کا دور شروع ہو گیا۔

صیغہ عدالت کی اصلاح و ترقی

۱۸۹۱ء میں صیغہ جوڈیشل کی نگرانی اور ہائی کورٹ کے فیصلوں کی اپیل سماعت کرنے کی خدمت بھی والد مرحوم کے سپرد ہوئی اور ۱۸۹۳ء میں کونسل آف ریجنسی نے قوانین کی اصلاح اور ترتیب کا کام بھی ان کے سپرد کیا۔ قانونی کمیٹی نے تین سال کی محنت کے بعد جو مسودات مرتب کیے تھے ان سب پر غور و نظر ثانی کر کے والد مرحوم نے ہر ایک قانون کے متعلق ایسے امور کونسل میں پیش کیے جو اصلاح یا ترمیم طلب تھے اور کونسل نے اُن کو منظور کیا۔

مذکورہ بالا محکمہ جات کی نگرانی اور خدمات کے علاوہ زمانہ کونسل میں ریاست کا کوئی صیغہ ایسا نہیں تھا جس کے متعلق والد مرحوم نے یادداشتیں لکھ کر کونسل میں پیش نہ کی ہوں اور مفید رائیں نہ دی ہوں۔ ان خدمات کے صلہ میں مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ نے والد مرحوم کو ریاست کے اول درجہ کے بارہ سرداروں میں جگہ دی اور برٹش گورنمنٹ نے مئی ۱۸۹۳ء میں "نواب" کا خطاب عطا کیا۔

ملازمت سے سبکدوشی اور نابینا بچوں کی تعلیم کا خیال

۱۸۹۶ء میں جب کونسل آف ریجنسی کی میعاد ختم ہوئی اُس وقت مہاراجہ صاحب بالقابہ نے نہایت احترام کے ساتھ والد مرحوم کو معقول پنشن دے کر سبکدوش کیا۔ پنشن لینے کے بعد چھ سال وہ زندہ رہے۔ اس زمانہ میں اکثر مقامات کا سفر کیا اور بہت سا وقت نابینوں کی مدد اور تعلیم کے لیئے وسائل بہم پہونچانے میں صرف کیا۔ نابینوں کی تعلیم اور پرورش کے متعلق مرحوم کا ارادہ کل ملک میں کوشش کرنے کا تھا۔ اس مسئلہ کی نسبت اُن کی جو تجویز اور تحریک تھی اُس کو اُنھوں نے ایک تحریر میں بیان فرمایا تھا جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

حضرات! میں نہایت ادب سے جس امر کی نسبت اس وقت سمع خراشی کرتا ہوں وہ اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے مگر دیرینہ خیال ہے۔ میں سالہا سال سے اس کو بیان کرنے یا اس کے متعلق کچھ عملی کارروائی کرنے کی فکر میں تھا مگر اب میں ضروری جانتا ہوں کہ جن مطالب نے میرے دل میں خطور کیا ہے اُن کو بیان کروں اور دیکھوں کہ اُس کے متعلق کہاں کہاں سے صدائے بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ میرا یہ پہلا مضمون اس وقت ایک عام تمہید اور تین گزارشوں اور ایک خاتمہ پر شامل ہے۔

عام تمہید اس تمہید میں ایک ایسے قابل افسوس مرض کا دل شکن تذکرہ ہے جو بھلے چنگے ذی قوت انسانوں کو آن واحد میں بالکل نکما اور واجب الرحم کر دیتا ہے۔ اس مرض کے موجود ہوتے ہوئے مقتدران روزگار کو لطف مقتدرت باقی نہیں رہتا پھر ادنیٰ درجہ کے لوگ کس شمار میں ہیں یہ ظالم مرض بینائی جاتی رہنا اور اندھا ہو جانا ہے۔ اب فرض کیجیے اگر کوئی بادشاہ ذی جاہ بھی اندھا ہو جائے تو باوصف کلی اقتدار کے وہ کس درجہ کا نکما ہوگا۔ کاغذوں کو ملاحظہ نہیں کر سکتا، اُن پر دستخط نہیں کر سکتا، نگرانی نہیں کر سکتا، پیاری اولاد کے تماشے دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا۔ میرے اس قول پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ زیادہ واجب الرحم ہونے میں اندھوں کی تخصیص کیا ہے دوسرے محتاج مریض لنگڑے

لولے، لنجے، بہرے وغیرہ وغیرہ اسی طرح درماندہ اور واجب الرحم ہیں تو ہیں جواب میں کہہ سکتا ہوں کہ امراض میں کوئی مرض اچھا نہیں اور ہر ایک محتاج اور مریض بقدر اپنی حالت مرض اور درماندگی مدد کا مستحق ہے لیکن سب امراض کی حالتیں یکساں نہیں ہیں اور میں جن اندھوں کی حالت زار کا بیان کرنے والا ہوں وہ حالت الامان اور الحفیظ پکارتی ہوئی خدا سے پناہ مانگنے کے قابل ہے چشم بینا چاہیئے جو دیکھے گوش شنوا چاہیئے جو سُنے۔ غور فرمائیے بہرا ہونا بھی اگرچہ من وجہ محتاج ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا تجربہ ہے بہرے آدمی گراں گوش یا زیادہ گراں گوش ہوتے ہیں زیادہ زور سے آواز دینے یا آلہ کان میں لگا لینے پر سُن سکتے ہیں میں نے لنگڑے آدمیوں کو لکڑی کا پاؤں لگا کر چلتے ہوئے دیکھا ہے مگر کسی اندھے کو لکڑی کی عینک سے کام چلاتے نہیں دیکھا میں نے تماشہ گاہوں مجمعوں اہنگاموں میں ہر قسم کے مریضوں کو محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے شامل ہوتے دیکھا ہے۔ نیز شادیوں کے موقعوں پر جو دولہ دُولہن کی سواریوں پر زر سُرخ وسفید ننگوٹا لٹایا اور خیرات کیا جاتا ہے اُس کے لوٹنے میں ہر قسم کے محتاجوں کو شریک ہوتے دیکھا ہے مگر کسی اندھے کو کبھی نہیں دیکھا۔ دوسرے مریضوں اور محتاجوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کو اپنے گرد وپیش کی معمولی چیزوں کو بھی ٹٹولنے یا دوسروں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے۔ آنکھیں جاتی رہنا وہ ستم کا واقعہ ہے کہ اُس کے بعد نہ ہاتھوں سے درست کام لیئے جا سکتے ہیں نہ پاؤں سے انسانی ضروریات لازمی کے روا ہونے کے واسطے بھی دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس عام درد انگیز حالت میں تو سب نابینا جب تک وہ اس حالت میں مبتلا رہیں لائق ہمدردی ہیں لیکن مقتدر لوگ جب اُن کی بینائی جاتی رہے اپنے علاج میں کوشش کر سکتے ہیں صرف زر کر سکتے ہیں قسمت اچھی ہو تو بینا ہو سکتے ہیں اور اگر علاج کامیاب نہ ہو تو معیشت موجود ہونے کی وجہ سے روزی اور ضروریاتِ لازمی کی تکلیف سے محفوظ رہ کر زندگی کے دن گزار سکتے ہیں۔ میں اپنے اس وقت کے بیان میں اُن اندھوں کی حالت پر بھی بحث کرنا نہیں چاہتا جو کہ اگرچہ زیادہ صاحب مقدرت نہیں ہیں لیکن اپنے خرچ سے سرکاری شفاخانوں تک جا سکتے ہیں

اور علاج کرا سکتے ہیں میرا دل تو اُن بدنصیب اندھوں کی حالت زار پر خون کے آنسو بہا رہا ہے جن کا کوئی سرپرست نہیں کہیں معاش کا ٹھکانا نہیں۔ اس بدنصیب گروہ سے تو جنگل کے وحشی اور ہوا کے پرندے بہتر ہیں وہ آنکھوں کی بدولت اپنے قوتِ بازو سے اپنی روزی اور ضروریات زندگی کی تلاش تو کر سکتے ہیں۔ اس محروم گروہ کی عمریں دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرنے، رستوں پر بھیک مانگنے اور چلائے جانے میں صرف ہو جاتی ہیں اور کوئی اُف نہیں کرتا۔ شادیوں میں تہواروں میں، رسوم معینہ اور رسوم اعتقادی میں مقتدران روزگار لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کرتے ہیں منتوں، مرادوں، کے واسطے بہت کچھ صرف کیا جاتا ہے لیکن یہ واجب الرحم گروہ خصوصیت کے ساتھ کس کو یاد ہے جو منتفع ہو سکے۔ ان میں بوجہ ضعف جسمانی یا درازی عمر کے جو لوگ زیادہ کمزور ہیں اُن کی افسوسناک حالت کا اندازہ تو وہی دل کر سکتا ہے جس میں پورا درد اور رحم ہو باقی وہ افراد جو بحالت عمر کے جوان ہیں یا اُن میں ذاتی طور پر جسمانی قوت موجود ہے اُنکی زندگی بھی مصیبت ناک ہے کیا معنی کس کو غرض ہے کہ اُن کی حالت کے مناسب اُن کے لیئے کوئی شغل یا محنت کا کام ایسا تجویز کرے جس سے اُن کی معیشت میں مدد اور صحت میں خوشحالی پیدا ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ سن رسیدہ اور کمزور اندھوں کو مدد پہنچانے اور قوت والے اندھوں کے واسطے شغل پیدا کرنے کی کسی کو پروا نہیں تو پھر اُن بیکس محتاج غریب اندھے بچوں پر کون متوجہ ہو سکتا ہے جن کو اس دردناک حالت میں پوری عمر گزارنے کو باقی ہے۔ ہائے ہم لوگوں کے دل پتھر کے ہیں جو بیبیب بیکسانہ حالتیں کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں مگر کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم ہر صبح اُٹھ کر دیکھتے ہیں کہ ایسی زار حالت پر بھی ظالم پیٹ اُن کو اطمینان سے ایک جگہ پڑ رہنے کی اجازت نہیں دیتا وہ لاچار بھیک مانگنے اُٹھتے ہیں کہیں ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں کہیں کیچڑ میں پھنستے راستہ چلنے مویشی سے ٹکراتے ہیں بیٹھے ہوئے کتے پر پاؤں پڑا اور کاٹ لئے گئے۔ ان کے گرد والوں کے پاؤں کو سانپ کاٹے یا بچھو وہ کب دیکھ سکتے ہیں۔ بھیک کے ٹکڑے آدھے پیٹ مل جانے اور کھا لینے کے بعد اگر اُن کو فطرتاً کوئی دم آسائش پانے کی آرزو دل میں پیدا ہو تو آرام دینے والا گھر اور گھر میں خدمت کرنے

اور راحت پہونچانے والی بی بی کہاں ہے جو آسایش کا کوئی سامان لے سکیں، پرندے جانور تک اپنے لیئے جوڑا تلاش کرکے اپنا وقت خوش گذارتے ہیں مگر ان کو کون قبول کرے اور اگر کوئی اپنی ہی حالت کا جوڑا مل بھی جائے تو کھانے کو کہاں سے آئے۔

آمدم بر سر مطلب یہ تو ظاہر ہے کہ کئی سال سے میرا دل اس واجب الرحم گروہ کی حالت پر دکھتا تھا۔ اس سال لشکر گوالیار سے جہاں کہ حضور مہاراجہ صاحب بہادر کے شاہانہ نظر عنایت کی وجہ سے زیادہ تر قیام میرا رہتا ہے۔ فروری کے مہینے میں علی گڑھ اپنے چھوٹے بیٹے آفتاب احمد خاں بیرسٹرایٹ لا سلمہ اللہ تعالے سے ملنے گیا وہاں کے قیام میں میرا ارادہ ہوا کہ میں کسی قدر عملی کارروائی کرکے اندازہ کروں کہ آئندہ مجھ کو اس معاملہ میں کہاں تک کامیابی کی امید ہے۔ اول میں نے اپنے اس ارادہ کی اطلاع جناب نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کو دی اُس کے جواب میں جو خط مجھ کو ملا وہ بہت دل بڑھانے والا تھا پھر میں ۱۵ مارچ ۱۸۹۹ء کو کرنال پہونچا اور مسٹر ملنی صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال سے بھی اس امر میں مشورہ کیا اور اُن کو اپنے سے متفق الرائے پایا۔ پھر میں قصبہ کنجپورہ میں گیا جو کہ میرا مولد اور اصلی وطن ہے یہ پنجاب میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے اور میں اسی ریاست کے خاندان میں ہوں۔ بوجہ حب وطن یہیں سے میں نے اس کارروائی کا آغاز مناسب جانا۔ یہ جگہ کرنال سے سات میل گوشہ مشرق و شمال میں ہے۔ اس قصبہ کی مردم شماری چار ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ میں نے محتاج اندھوں کی تعداد کی تحقیقات کی تو وہ سب اندھے شمار میں اکیاسی تھے۔ اُن میں مرد عورت بچے ملا کر پینسٹھ[۶۵] اندھے تو ایسے پائے جن کی آنکھیں بالکل بیٹھ چکی تھیں یا یہ کہیئے کہ بالکل بند تھیں اور سولہ اندھے ایسے پائے جن کی بصارت تو جاتی رہی تھی لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس واسطے میں نے ان کھلی آنکھوں والے اندھوں کی خدی فہرست مرتب کی اور خیال کیا کہ ہرگاہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو ممکن ہے کہ بسبب پردے یا ڈھیلے یا پتلی میں جو نقصان آگیا ہے وہ علاج ہونے سے صحت پذیر ہو جاوے۔ یہ خیال کرنے کے بعد میں نے اول الذکر پینسٹھ بند آنکھوں والے اندھوں کی فہرست بنام نہا دیابس العلاج

اندھوں کے واسطے ایک خاص مناسب وقت انتظام کیا اور سولہ اندھوں کے واسطے کرنال آکر
صاحب ڈپٹی کمشنر اور سول سرجن صاحب کرنال سے گفتگو کرنے کے بعد یہ امر طے کیا کہ ۲۰ اپریل
۱۸۹۹ء کو ڈاکٹر صاحب کنجپورہ جاکر اُن سولہ اندھوں کا معائنہ کریں گے۔ میں مطمئن ہو گیا اور
وہاں سے روانہ ہو کر لشکر گوالیار میں آ گیا۔ گوالیار میں پہونچنے کے بعد کنجپورہ کی تحریر سے مجھ کو
معلوم ہوا کہ ۲۰ اپریل کو ڈاکٹر صاحب سول سرجن معہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کرنال کنجپورہ کو گئے
معائنہ کے وقت صرف تیرہ اندھے حاضر اور تین غیر حاضر ملے۔ اُن تیرہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد
پانچ اندھوں کو ڈاکٹر صاحب نے جواب دے دیا کہ اُن کی آنکھیں نہیں بن سکتیں اور آٹھ اندھوں
کو اُمید دلائی کہ علاج ہونے پر اُن کی آنکھیں اچھی ہو جانے اور بصارت حاصل ہونے کی اُمید
ہے اور شفاخانہ کرنال میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ دوسری صبح کو میرے ملازمین موجودہ کنجپورہ نے
ہر ایک اندھے کے گھر پر سواری موجود کر دی تا کہ سوار ہو کر شفاخانہ کرنال میں پہنچ جائیں۔
اُن میں چار اندھوں نے اپنی بدعقلی اور بدقسمتی سے پھر انکار کیا کہ ہم شفاخانہ کرنال میں نہیں جاتے۔
باقی ماندہ چار اندھے سوار ہو کر شفاخانہ کرنال پہونچے اور اُن میں علاج ہونے پر تین اندھوں
کی آنکھیں اچھی ہو کر وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ اس مختصر تجربہ سے اگرچہ میرے خیال کو
کسی قدر مدد ملی لیکن تاہم میں نے سمجھا کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مایوس العلاج اور ممکن العلاج
اندھوں کی تعداد اسی نسبت سے ہر جگہ ہو گی کیا معنی ہر شہر ہر قصبہ ہر آبادی میں بوجہ اختلاف آب
ہوائے ملک و طرز معاشرت باشندگان و صفائی و غیر صفائی مساکن حدوث امراض کے جداگانہ
اسباب ہوتے ہیں لیکن اس امر پر غور کرنے کا موقع بہرحال مجھ کو ملا کہ اس واجب الرحم گروہ
میں اُن کی بدنصیبی یا دانائی یا بدعقلی کے سبب باہم لوگوں کی ناخدا ترسی اور بے پروائی کے
باعث یا گورنمنٹ کی ناواقفیت کی وجہ سے ایک قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی بھی موجود ہے
جن کی آنکھیں علاج ہونے پر اچھی ہو سکتی ہیں لیکن اس امر پر اب تک کسی نے توجہ نہیں کی نیز
یہ امر بھی ثابت ہوا کہ جہالت اور بدعقلی کا خیالی خوف ایسے ضروری علاج سے بعضے بدنصیبوں کو

باز رکھتا ہے۔ ان امور پر نظر کرتے ہوئے میں اس فکر میں پڑا کہ ایسے نادار اندھوں کی عام رفاہ و فلاح کے متعلق کس طریقے سے کوشش کی جائے اور اس کوشش میں کس کس کی شرکت کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ میں اس امر میں متردد تھا کہ میں جب تک چند مقامات میں کوشش کرکے نمایاں نتائج حاصل نہ کروں تب تک گورنمنٹ میں اطلاع یا کسی امر کی تحریک کرنا یا بیان باخنبار سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ظاہر کرنا بہتر نہیں نیز اس معاملہ کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہوئے یہ تذبذب تھا کہ کسی مدرسہ کے قایم کرنے کی کوشش نہیں جس کے واسطے کوئی خاص مقام ہیڈ کوارٹر قرار دیا جاکر رفتہ رفتہ تدریجی کوشش ہوتی رہے یہ کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے جس کی شرکت میں لوگوں کو اپنے کسی دنیوی نفع کی امید ہو یا نمایش یا شان وشوکت کے حصول کا احتمال ہو یہ کام تو محض خدا کی رضامندی اور ایک واجب الرحم گروہ کی ہمدردی اور رفاہ کا ہے جو کہ مختلف مقامات میں وہاں کی حالتوں پر نظر کرتے ہوئے انجام دیا جائے گا۔ یہ مختلف خیالات میرے دماغ میں دَور کر رہے تھے کہ ایک زبردست ہاتھ نے میری ایسی مدد کی جس سے میرے ارادہ کے ڈگمگاتے ہوئے پاؤں مستقل جم گئے اور ایک دوسرے تجربہ کی اُمید نے میرے خیالات میں پوری اُمنگ پیدا کردی اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اپنے گزشتہ کارروائی کی اطلاع اور اپنے آئندہ ارادہ کی نوعیت اپنے آقائے ولی نعمت حضور مہاراجہ مادھوراؤ صاحب بہادر سیندیا دام اقبالہٗ سے عرض کی اور ایک نمونہ فہرست کا پیش کیا حضور نے اُسی وقت کمال خوشی سے لے کر اُس نمونہ کے مطابق فہرستیں مرتب ہونے کے احکام جاری فرمائے اور فہرستیں مرتب ہوجانے پر وہ سب فہرستیں میرے پاس بھیج دیں۔ ان فہرستوں سے واضح ہوا کہ خاص لشکر گوالیار میں جس کی مردم شماری کی تعداد ۸۵۵۴۳ ہے کل اندھوں کی تعداد مرد عورتیں بچے ملاکر ۳۹۷ ہے اُن میں ۱۶۷ کی آنکھیں بند تھیں اور ۲۳۰ اندھوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہ تعداد معلوم ہوجانے کے بعد کھلی آنکھوں والے اندھوں کی فراہمی کا انتظام کیا گیا اور میری موجودگی میں میرے شفیق ڈاکٹر کرافٹ صاحب معالج حضور معلےٰ وافسر اعلیٰ شفاخانہ جات ریاست گوالیار نے ہر ایک اندھے کو

معائنہ کرنا شروع کیا تین روز تک یہ کارروائی جاری رہی۔ اس عرصہ میں ۱۸۰۔ اندھوں کا معائنہ ہوا کیونکہ ۲۳۰ میں سے ۴۲ بدنصیب اندھے باوصف فہمایش کے بھی اپنی بدعقلی و خیالی خوف کی وجہ سے معائنہ کے لیئے حاضر نہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کے بعد ان (۱۸۸) معائنہ شدہ اندھوں میں ۱۲۶۔ اندھوں کی آنکھیں ناقابل صحت قرار دے کر کہہ دیا کہ ان کی آنکھیں نہیں بن سکتیں اور باقی اندھوں میں ۲۹ کی نسبت قطعی اُمید صحت اور ۳۳ کی نسبت احتمالی اُمید صحت قرار دے کر ۲۵۔ اندھوں کو قابل علاج انتخاب کیا جن کا علاج خدا کے فضل سے جلدی شروع ہوتا ہے۔ نیز یہ امر بھی بیان کرنے کے لائق ہے کہ یہاں کی مجموعی تعداد ۲۷۰۔ اندھوں میں صرف نوے اندھے ایسے ہیں جن کی معاش کا کہیں ٹھکانہ نہیں پس اُن کی مدد کے واسطے بتوجہ حضور مہاراجہ صاحب بہادر مناسب تجویزیں زیر غور ہیں جن کا عملدرآمد بہت جلد ایک عام جلسہ کے بعد شروع ہوگا اُسی کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ مشقت جسمانی اور تعلیم کے کاموں پر بھی مناسب غور کے بعد کارروائی ہوگی غرض کنجپورہ کے تجربہ کے بعد لشکر گوالیار کے اس دوسرے تجربہ نے جو حضور اقدس مہاراجہ صاحب بہادر دام اقبالہ کی خاص مدد اور خاص عنایت کی وجہ سے مجھ کو حاصل ہوا میرے ارادہ میں یہ وسعت پیدا کردی کہ اب میں بے تکلف گورنمنٹ ہند سے اور دوسرے رئیسان با اختیار سے اور پبلک سے جو کچھ گذارش کرنا ضرور سمجھوں وہ عرض کروں۔ گورنمنٹ ہند سے مالی مدد کی خواہش بالکل نہیں ہے مالی مدد کے واسطے جو کہنا ہے وہ پبلک سے کہا جائے گا لیکن امور ذیل میں گورنمنٹ کی مدد کی البتہ ضرورت ہے۔

(۱) اندھوں کی تعداد معلوم کرنے کی غرض سے اہتمام کرنے اور فہرستیں مرتب کرا دینے میں۔

(۲) کھلی آنکھوں والے ممکن العلاج اندھوں کے علاج کے متعلق اہتمام کرنے میں۔

(۳) مایوس العلاج اندھوں کی منتظم کمیٹی کے کاروبار میں مدد دینے اور نگرانی کرنے میں۔

نظر بہ وجوہ بالا میں ایک گزارش گورنمنٹ کی خدمت میں اور دوسری روسا ء با اختیار کی خدمت میں اور تیسری پبلک کی خدمت میں کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ہر ایک گذارش کے

الفاظ سے خود واضح ہو جائے گا کہ میں کس سے کیا چاہتا ہوں۔

گذارش اوّل بخدمت گورنمنٹ عالیہ ہند

ای رحیم اور منصف گورنمنٹ تیرا کروڑوں روپیہ رعایا کی رفاہ اور فلاح میں صرف ہو رہا ہی پھر بیکس افراد اس نفع سے کیوں محروم ہیں اگر یہ کہا جائے کہ گورنمنٹ نے شفاخانے جاری کر رکھے ہیں اُن میں ڈاکٹر موجود ہیں جس مریض کو ضرورت ہو وہاں جائے علاج ہوگا۔ڈاکٹر لوگ شفاخانوں کا کام چھوڑ کر شہروں کی سڑکوں پر یا قصبات و دیہات میں مریضوں کی تلاش نہیں کر سکتے ہیں اس کے جواب میں نہایت ادب سے ضرور یہ عرض کروں گا کہ میں جن لاوارث مفلس اندھوں کے متعلق عرض کر رہا ہوں وہ بے شک شفاخانوں تک نہیں جا سکتے کیونکہ نہ تو وہ اس قدر سمجھ رکھتے ہیں کہ ہماری آنکھیں قابل علاج ہیں یا نہیں اور نہ اُن کے پاس ایک وقت کا کھانے کو ہی کہ وہ خود کو بھیک مانگنے سے ایک وقت بھی معاف کر کے شفاخانوں تک جانے کا ارادہ کریں وہ اس قدر رقم بھی اپنی گرہ میں نہیں رکھتے کہ شفاخانوں تک پہونچانے کو کسی مزدور کی مزدوری ادا کر سکیں جبکہ اُن کی بیکسی کا یہ حال ہی تو کیا سرکار کی خاص توجہ فرمانے کے وہ مستحق نہیں ہیں درحالیکہ سرکار چیچک کے ٹیکہ کے واسطے لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہی۔ ٹیکا لگانے والے قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں گھر گھر پھرتے ہیں تو اگر اسی طرح کوئی سہل سا طریقہ اندھوں کی فہرستیں مرتب کرنے اور اُن میں کھلی آنکھوں والے اندھوں کے علاج کا مقرر فرما دے تو تیری رعایا پروری سے کیا بعید ہی۔ میونسپلٹیوں کی معرفت سے تحصیلداروں کی وساطت سے نیز دوسرے ذرائع سے بہ سہولت یہ کارروائی ممکن ہی۔ مایوس العلاج اندھوں کی مدد کے واسطے ہم ہاتھ سے کہیں گے لیکن ممکن العلاج اندھوں کے علاج میں تو مدد کرو۔

مرحوم کا جو ارادہ تھا اُس کو انھوں نے مذکورہ بالا تحریر میں بیان کیا ہی چنانچہ انتقال کے وقت تک اسی فکر میں رہے اور اُسی زمانہ میں انھوں نے خاص لشکر گوالیار میں نابینوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا جو اب تک موجود ہی۔ اُس میں نابینا لڑکوں کو پرائمری نظمیں یاد کرائی جاتی ہیں
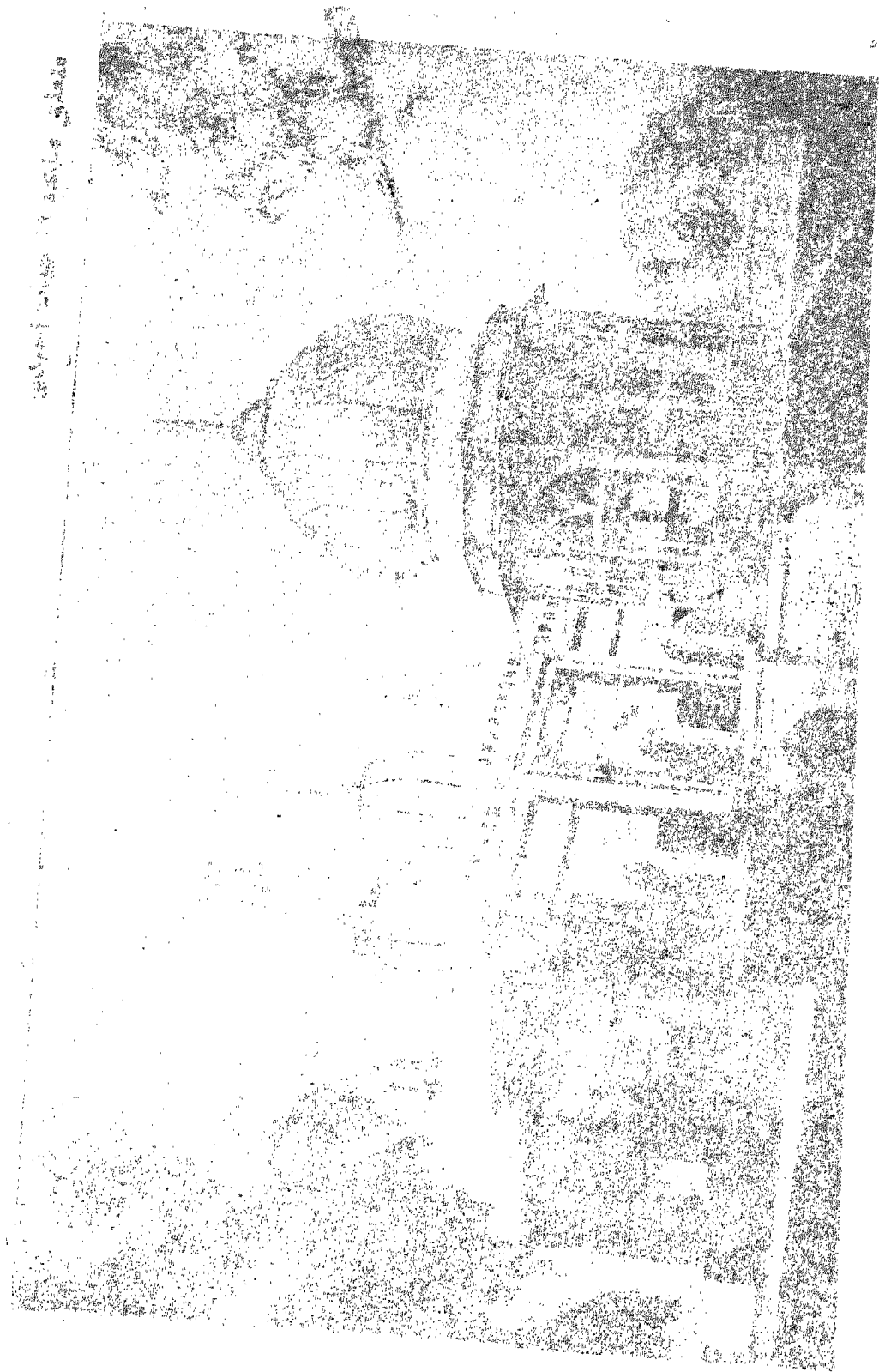
گانا بجانا سکھایا جاتا ہی۔ دستکاری مثل چٹائی اور مونڈھے وغیرہ بنانا سکھائی جاتی ہی غرض یہ ہی کہ اس تعلیم سے یہ محتاج طبقہ کسب معاش کے قابل ہو جائے اور بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو۔ تقریباً اٹھائیس سال سے یہ مدرسہ قایم ہی اس عرصہ میں بہت سے نابینا یہاں سے تعلیم پاکر مختلف شکلوں میں کسب معاش کر رہے ہیں۔

علالت و وفات مرحوم کا یہ مصمم ارادہ تھا کہ ملک میں جو نابینا ہیں اور جو قابل علاج ہیں اُن کا علاج کرائیں اور جو مایوس العلاج ہیں ان کے لیئے اسی قسم کے مدارس قایم کرانے میں سعی کریں لیکن عمر نے وفا نہ کی اور صرف ایک ہفتہ کی علالت کے بعد ۱۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڈھ والد ماجد نے انتقال فرمایا۔ علی گڈھ میں شاہ جمال صاحب کی درگاہ اور عید گاہ کے درمیان مرحوم کا مزار ہی جو مزار احمدی کے نام سے مشہور ہی۔ مزار کے ساتھ جو مسجد ہی اُس میں ہر سال عرس ہوتا ہی جس میں مرحوم کی مشہور کتاب صبح نور کے مضامین اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ مزار کا فوٹو اس کتاب میں ناظرین کے ملاحظہ کے لیئے چھاپا جاتا ہی۔

حلیہ و وضع قطع یہ حقیقت واقعی ہی کہ گو کنجپورہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہی اور اُس کی آبادی زیادہ تر کچے مکانات کی ہی لیکن وہاں کے پٹھان صورت اور قوی کے لحاظ سے اس نواح میں ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔ خاصکر ہمارے خاندان کے لوگ عموماً حسین اور تنومند ہوتے رہے ہیں اور تمام خاندان میں ہماری شاخ کو ابتدا سے یہ امتیاز حاصل رہا ہی۔ ہمارے دادا محمد نور خاں صاحب اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ خوبصورت، زبردست اور دلیر مشہور رہے۔ اسی طرح ہمارے والد مرحوم اپنے وقت میں اپنے تمام خاندان اور بستی میں خوش رو اور قوی تھے۔ علاوہ کنجپورہ کے ٹونک اور گوالیار کے درباروں میں ہمیشہ انھیں پر نگاہ پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ ۱۸۹۵ء میں جب کہ ہم دونوں بھائی مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں تعلیم پاتے تھے وہ علی گڈھ تشریف لائے اُس وقت یہاں کالج کے پروفیسروں میں مسٹر والسن نامی ایک انگریز پروفیسر تھے اُن پر والد کی وجاہت کا ایسا اثر ہوا کہ جب والد گوالیار واپس جانے کے لیئے ریلوے اسٹیشن پر جا چکے تھے تو مسٹر

واپس اُن کو دوبارہ دیکھنے کے لیے اسٹیشن پر جاکر پھر اُن سے ملے۔

والد مرحوم کا رنگ نہایت سفید اور سُرخ تھا۔ پیشانی کشادہ سر بڑا مگر اُس کی بناوٹ نہایت موزوں، آنکھیں بڑی، ناک باریک اور اونچی مگر اُس کی تراش نہایت موزوں، داڑھی بہت گھنی اور پورا خط بھرا ہوا۔ چہرہ کی مجموعی ہیبت نہایت دلکش اور حسین، تبسم اور ہنستے وقت اُن کے چہرہ کا حُسن اور بھی دلکش ہو جاتا تھا۔ قد لانبا تقریباً چھ فٹ لیکن چونکہ جسم بہت فربہ تھا اس لئے موزوں اور میانہ معلوم ہوتا تھا۔ صحت کی حالت میں اُن کا وزن ساڑھے تین مَن تھا۔ جسم کے تمام اعضا قوی اور باوجود اس قدر فربہی کے بدن ٹھوس اور چست اور چالاک تھا۔ آخری عمر تک جسمانی ورزش اُنھوں نے کبھی ترک نہیں کی، مُگدروں کے کئی سو ہاتھ وہ ہمیشہ ہلاتے تھے۔ اور میلوں پیدل چلتے تھے۔ گو بدن موٹا تھا مگر مزاج اس قدر حار تھا کہ سردی کے موسم میں بھی اُن کے بعض حصوں پر پسینہ رہتا تھا۔ لباس اُن کا آخری عمر تک ہندوستانی رہا۔ عموماً سادہ لباس پہنتے تھے، البتہ عیدین یا جلسوں کے موقع پر وہ زریں پوشاک کا استعمال کرتے تھے مگر معمولی سے معمولی لباس بھی اُن کے جسم پر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اُن کے عمامہ کی خاص وضع تھی جیسا کہ اُن کے فوٹو سے معلوم ہوگا۔ غرضکہ جسمانی وجاہت حسن و شان کے لحاظ سے وہ ہر مقام اور ہر موقع پر اپنے ہمعصروں میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے۔

اولاد انتقال کے وقت مرحوم نے دو بیٹے یعنی ہم دونوں بھائی اور ایک بیٹی چھوڑی۔ علاوہ ہمارے اور ہماری بہن کے تین بھائی اور تین بہنیں اور ہوئے تھے لیکن اُن سب کا کم عمری میں انتقال ہو چکا تھا۔

ترکہ یہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ علاوہ تنخواہ کے مرحوم کی اور کسی قسم کی آمدنی نہ تھی لیکن یہ اُن کے حسن انتظام اور معتدل اور محتاط زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھا کہ باوجود اپنی اولاد اور متعلقین کو ہر طرح پر نہایت آسایش سے رکھنے کے اور باوجود ہماری تعلیم پر نہایت فراخ حوصلگی سے صرف کرنے کے اور عام معیار کے مطابق پورے شان اور ساز و سامان کے ساتھ عمر بھر رہنے کے بعد انتقال کے

وقت انھوں نے نقد کی شکل میں معقول رقم کے علاوہ وطن میں دو پختہ دو منزلے بڑے مکانات اور گوالیار میں نہایت عالی شان پتھر کا مکان جو انھیں کی آمدنی سے تعمیر ہوئے تھے وہ اور دو کمپنیوں میں کچھ حصے چھوڑے۔ ان کے علاوہ بہت کچھ سامان مثل فرنیچر اور ظروف وغیرہ چھوڑا۔ مرحوم کے ورثا والدہ مرحومہ ہم دونوں بھائی اور ہماری بہن تھیں۔ ورثا میں جس طرح ترکہ تقسیم ہوا اور ترکے کے متعلق ہم میں سے ایک دوسرے کا جو طرزِ عمل رہا وہ قابل ذکر ہے۔ بنک میں جس قدر نقد جمع تھا اُس کی اور کمپنیوں کے حصوں کی جو کچھ آمدنی تھی وہ والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت تک کلیتاً ان کے تصرف میں میں رہی۔ ان کے انتقال کے بعد جو رقم بنک میں جمع تھی اُس کے مساوی تین حصے کرکے ایک ایک حصہ ہم دونوں بھائیوں کے نام اور تیسرا برابر حصہ ہماری بہن کے نام درج ہوگیا۔ کمپنیوں کے حصوں کی جس قدر آمدنی تھی وہ وقف کردی گئی اور اُس میں سے جس قدر گذارے رشتہ داروں یا ملازموں کے لیے مقرر تھے یا خیراتی کاموں کے لیے جو رقوم ماہانہ دی جاتی تھیں اور مرحوم کے مزار اور سالانہ عرس کے جو اخراجات ہیں یہ سب اس آمدنی سے ادا ہوتے ہیں اور آئندہ کے لیے یہ تمام آمدنی "احمدی مدرسہ نابینایان علی گڈھ" کے لیے وقف کی جاوے گی۔ باقی جس قدر ساز و سامان تھا اُس کی نسبت کبھی کوئی تقسیم آج تک نہیں ہوئی۔ ہم میں سے جس نے جس چیز کو چاہا لے لیا لیکن ہم میں سے ایک دوسرے کو کبھی کسی قسم کا خیال تک نہیں ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ بہت تھوڑے ترکہ کی تقسیم کے متعلق بھی ورثا میں عام طور پر جھگڑے اور مقدمات تک ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کے ترکہ کی بابت خود ہم ورثا کو معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح تقسیم ہوا اور اُس کی نسبت ہم میں سے کسی ایک کو بھی کبھی خیال تک نہیں ہوا۔ یہ مرحوم کی ذات اور صحبت کا اثر ہے کہ ان کی اولاد میں تنگ دلی نہیں ہے اور اُن میں آپس میں ایک دوسرے پر پورا بھروسہ ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکے گا کہ جو ترکہ بنک میں روپیہ اور کمپنیوں میں حصوں کی شکل میں تھا ہم میں سے بڑے بھائی نے اُس کو اپنے چھوٹے بھائی کے نام درج کرادیا اور اس وقت تک چھوٹے بھائی ہی کے اہتمام میں وہ سب ہے۔ آج تک نہ بڑے بھائی نے اور نہ بہن نے کبھی بھی دریافت کیا کہ چھوٹے بھائی نے مشترکہ ترکہ کو کس طرح صرف کیا

غرضیکہ ہم بھائی بہنوں میں خدا کے فضل سے ایسے تعلقات ہیں کہ بمقابلہ ایک دوسرے کی محبت اور دلداری کے کسی قسم کے ساز و سامان کی کچھ وقعت نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ باوجود معقول ترکہ کے آج تک کبھی کسی کو معلوم تک نہ ہوا کہ ہم میں وہ کب اور کس طرح تقسیم ہوا۔

تیسرا باب

خانگی حالات اور حسن معاشرت

انسان کی طبیعت اور اس کے کیریکٹر کا اصلی امتحان اور اندازہ اس کے خانگی تعلقات اور طرز عمل سے ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ انھیں میں گذرتا ہے۔ خانگی زندگی میں اول زوج شوہر کے تعلقات ہیں اور پھر اولاد کے متعلق ادائے فرض اور طرز عمل۔ اس کے بعد رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ اور آخر میں ملازمین کے ساتھ برتاؤ۔ ان تمام تعلقات اور رشتوں کے لحاظ سے والد مرحوم کا طرز عمل کامل طور پر صحیح اور وفادارانہ ابتدا سے اور آخر تک رہا۔

حقوق الزوجین سولہ برس کی عمر میں اُن کی شادی ہوگئی تھی اُس وقت سے دم واپسیں تک اُن کا پورا دل والدہ مرحومہ کے لیئے وقف رہا۔ برسوں وہ وطن سے دور اور والدہ ماجدہ سے علحدہ ٹونک اور گوالیار جیسے مقامات میں رہے لیکن باوجود مشہور حسین اور غیر معمولی تندرست اور قوی ہونے کے اُن کی وفاداری اور پرہیزگاری میں کبھی فرق نہیں آیا باوجودیکہ اُن کی تمام جوانی ریاستوں میں اور ایسے ماحول میں گذری جہاں رنگین صحبتیں اور ناچ رنگ سوسائٹی کا لازمی جزو سمجھے جاتے تھے لیکن وہ ہمیشہ اس قسم کی اخلاقی آلودگیوں سے پاک و صاف رہے۔ ہم نے کبھی اپنے مکان پر ناچ یا مجرا ہوتے یا کسی بازاری عورت کو آتے نہیں دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گو ہم کو ہزاروں حاضرین کی مجالس یا جامع میں یا بڑے سے بڑے درجہ کے شخص کے سامنے تقریر کرنے میں باک نہیں لیکن کسی بازاری عورت سے آنکھ

ملاکر بات کرنے میں ہم کو سخت حجاب معلوم ہوتا ہی۔ غرضکہ والد مرحوم کا پورا شوق اور لطف معاشرت تمام عمر والدہ مرحومہ کے لیئے محفوظ اور وقف رہا۔ اس امر میں جوان کا خیال اور عمل تھا اُس کو انھوں نے اپنی نظم موسومہ "ہمت مردانہ" کے ایک بند میں ذیل کے اشعار میں ظاہر فرمایا ہی ؎

منکوحہ گل اندا موں سے عشرت نہ کریں کیوں — ہیں جن کے لیئے اُن سے محبت نہ کریں کیوں
خود لائیں جنھیں بیاہ کے اُلفت نہ کریں کیوں — مطلوب رضا جو سے مُروّت نہ کریں کیوں

مجبور پھریں کس لیئے ان سیم تنوں سے
جادو نظروں حور وشوں گلبدنوں سے

یہ صاحب عصمت یہ وفادار یگانہ — یہ زینتِ ایوان یہ رونق دہ خانہ
آنکھوں میں حیا دل میں ادب طرز بتانہ — بیجا نہ تَبَسُّم نہ تکلم نہ ترانہ

ہمراہ رہیں تا نفس بازپسیں یہ
ہم شاد تو یہ شاد حزیں ہم تو حزیں یہ

جو کچھ ان اشعار میں مرحوم نے فرمایا ہی کلیتاً اُن کا اس پر عمل رہا۔ حقیقت یہ ہی کہ جس قسم کے ماحول اور سوسائٹی میں ان کی عمر گزری اُس کے اخلاقی پہلو سے مسلسل اور شدت اور اہتمام کے ساتھ پرہیز اور احتراز کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ والد مرحوم کی زندگی زیادہ تر فرایض منصبی کے انجام دہی یا تنہائی میں گذرتی تھی۔ اُن کے ہم عصروں اور ہم رتبہ اصحاب میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ بے تکلف یا خلا ملا بھی ہوئے ہوں۔ پورے طور پر بے تکلفی کے ساتھ اگر وہ کسی سے ہنستے بولتے تھے تو صرف ہماری والدہ سے یا ہم دونوں بھائیوں سے یا ہمارے بچوں سے۔ اُن کے تہذیب اور وقار کی یہ کیفیت تھی کہ ہم نے کبھی اُن کی زبان سے کوئی فحش لفظ نہیں سُنا اور نہ مذاق میں اور نہ غصہ کی حالت میں کبھی کسی کو گالی دیتے یا جھکڑ بولتے ہم نے سُنا۔

اولاد سے شفقت ومحبت اور اُن کی تعلیم وتربیت کا خاص طریقہ

ہمارے ساتھ جو غیر معمولی محبّت اور شفقت اُن کو تھی اُس کی یاد ہمارے دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا

اور والد مرحوم کے انتقال کے وقت تک جس قدر ہم کو اُن کی صحبت میں خوشی ہوتی تھی اور کسی سے ملنے میں نہ حاصل ہوتی تھی چھوٹی عمر میں جب ہم وطن میں تھے اُس زمانہ میں والد سال بھر کے بعد رخصت پر تشریف لایا کرتے تھے۔ اُن کے آنے کا انتظار ہم کو بہت روز پیشتر سے رہتا تھا۔ علی گڈھ میں جب ہم تعلیم پاتے تھے تو چونکہ ہر ہفتہ اُن کا خط آتا تھا اُس کے انتظار اور شوق میں چھٹی رساں کی طرف ہماری نگاہ رہا کرتی تھی۔ غرضکہ اُن کی صحبت اور ان کی ہر ایک چیز ہم کو دل سے مرغوب اور پیاری تھی اس برتاؤ اور تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی شخصیت، حُسنِ اخلاق اور اطوار و عادات کا ہماری تمام زندگی پر ایسا گہرا اثر ہی جس کو ہم ہر حالت اور موقع پر محسوس کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک زندگی میں ہم کو جس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہو اس میں اس کا بہت بڑا حصہ ہی۔ پدرانہ شفقت تو کوئی غیر معمولی چیز نہیں لیکن ہماری حالت میں خاص ذکر کے قابل وہ اس وجہ سے ہی کہ اُس کے ذریعہ سے والد مرحوم نے اپنی اعلیٰ صفات اور اخلاقی خوبیوں کو ہمارے لیئے ایسا مرغوب اور محبوب کر دیا کہ بغیر کسی دقّت یا کوشش کے غیر معلوم اور غیر محسوس طور پر اُن کا رنگ ہم پر بہت کچھ چڑھ گیا اور اس میں شک نہیں کہ اس حقیقت کا ثبوت کہ شفقت تربیت کا بہترین آلہ ہی ہماری حالت میں پورے طور پر ہمارے سامنے موجود ہی۔

بچوں کی تربیت کے متعلق والد مرحوم کے خیالات خاص تھے۔ ہماری سوسائٹی میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "بچوں کو کھلایئں سونے کا نوالہ لیکن دیکھیں شیر کی نگاہ"۔ والد مرحوم اس قسم کے خیالات کو سراسر غلط اور مضر سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ بچوں کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ وہ والدین سے متنفر ہو کر نوکروں یا غیروں کی صحبت اختیار کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں جس سے اُن کے اخلاق خراب ہوتے ہیں چنانچہ ہماری قوم کے رؤسا اور خوشحال لوگوں کے بچوں کے اخلاق اسی قسم کے غلط طریقوں کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ والدین کا فرض اولیں یہ ہو کہ اپنے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری کو نہ صرف سمجھیں بلکہ اُس سے پورا کرنے کی قابلیت خود اپنے میں پیدا کریں۔ والدین امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل کسی حالت میں بھی ہوں قدرتی طور پر بچوں کے لیئے

سب سے اول نمونہ وہ ہی ہوتے ہیں اور اس لیئے خود اُن کے اپنے اخلاق اور طرز عمل پر بچوں کی تربیت کا بہت کچھ دار و مدار ہے۔ پس جس اصول پر والد مرحوم کاربند تھے اُس کے مطابق بچوں اور والدین دونوں کی تربیت لازم ملزوم ہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہم نے سب سے زیادہ پیاری شخصیت اپنے پیارے ابا جان کو پایا کیونکہ اُن کے پدرانہ برتاؤ میں ایسی کشش تھی کہ ہم دل سے اُن کے گرویدہ تھے اور اُن کی صحبت اور محبت کی ہمارے دلوں میں ہر چیز سے زیادہ قدر تھی۔ اسی کے ساتھ اُن کا ادب اور اُن کی وقعت بھی ہمارے دلوں میں اس قدر تھی کہ کسی اور کی نہ تھی۔ یہ حقیقت خاص ذکر کے قابل ہے کہ اُنھوں نے نہ کبھی ہم کو مارا اور نہ کبھی ہم کو جھڑکا لیکن باوجود اُس بے تکلفی اور آزادی کے جو اُن کی خدمت میں ہم کو ابتدا سے حاصل تھی صرف اُن کا کبھی نہ بولنا یا نگاہ پھیر لینا ہمارے لیئے ہزار زدوکوب سے زیادہ باعث تنبیہ اور خوف ہوتا تھا کیونکہ اُن سے بولنا اور ہنسنا اور اُن کی صحبت ہم کو اس قدر عزیز تھی کہ تھوڑی دیر کے لیئے بھی اُس سے محروم ہونا ہم کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ پس باپ ہو یا اُستاد، تربیت کے لیئے عام طور پر بہترین طریقہ اور آلہ یہی ہے کہ بیٹے یا شاگرد کے دل میں باپ یا اُستاد اپنی ذات کو اس قدر محبوب بنا دیں کہ بیٹے یا شاگرد کو اُس کے ساتھ عشق ہو جائے۔ عاشق سے (اُس کے عشق کے درجہ کے مطابق) کام کرا لینا ظاہر ہے کہ دُشوار نہیں مگر باپ یا اُستاد میں محبوب بننے کی قابلیت اور بیٹے یا شاگرد میں عاشق بننے کی صلاحیت بہت کم یاب ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ خدا کے فضل سے ایک حد تک یہ نعمت ہم کو حاصل ہوئی جس کے لیئے ہم اپنے والد مرحوم کے ہمیشہ کے لیئے ممنون رہیں گے۔

ہم پر والدہ مرحومہ کے احسانات

جہاں ہم پر والد مرحوم کے بے شمار احسانات ہیں اُن کے ساتھ ساتھ والدہ مرحومہ کے احسانات کا ذکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ جہاں تک کہ شفقت مادری کا تعلق ہے ہماری والدہ اُن خاص ماؤں میں سے تھیں جن کو اولاد کی

اولاد پر اعتماد والد مرحوم نے جس طرح ہماری تربیت کی اُس کے سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ابتداسے اُن کو ہم پر پورا اعتماد تھا۔ مثلاً وطن میں نیا مکان تعمیر ہوا جبکہ ہماری عمر بہت کم تھی، لیکن اُس کا سارا اہتمام ہمارے سپرد تھا۔ ہزاروں روپیہ کا سامان خود ہم نے خرید کیا۔ ہم نے مکان کا نقشہ تجویز کیا۔ ہم نے اُس کی تعمیر کا انتظام کیا۔ جب جس قدر خرچ کی ضرورت ہوئی ہم نے مانگا اُنھوں نے فوراً بھیج دیا اور گو جو کچھ وہ خود خرچ کرتے تھے اُس کا حساب روزانہ اپنے قلم سے لکھتے رہے لیکن ہم نے جو کچھ خرچ کیا حساب ہم سے کبھی طلب نہیں کیا۔ ہم میں سے چھوٹے بھائی کی شادی کا پورا اہتمام بڑے بھائی نے کیا والد مرحوم صرف عین شادی کے موقعہ پر آکر تقریب میں شریک ہوگئے اور کل انتظام اور خرچ کلیتاً بڑے بھائی کے سپرد کر دیا غرضکہ مرحوم نے ہم پر ہمیشہ اعتماد کامل رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو ذمہ داری لینے اور اُس کو دیانت کے ساتھ پورا کرنے کا سبق چھوٹی عمر سے حاصل ہوتا رہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) آسایش اور فلاح کے لیے ہر ایک قسم کی قربانی کرنے میں سب سے زیادہ خوشی اور راحت ہوتی ہو۔ چونکہ ہم دونوں کی پیدایش سے بیشتر جو بھائی بہن ہوئے تھے وہ سب مر چکے تھے اس لیئے ایسے صدمات سے محبت مادری میں جو خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہو وہ ہمارے متعلق ہماری والدہ کے دل کی تھی جس کے سبب سے ہر وقت اُن کو ہماری صحت اور زندگی کے متعلق فکر رہتی تھی مگر باوجود اس قدر محبت اور دلی لگاؤ کے جب والد مرحوم نے ہماری تھوڑی عمر میں ہم کو والدہ مرحومہ سے علٰحدہ کرکے علی گڈھ بھیجنا چاہا تو والدہ نے مادرانہ محبت کے جذبات پر مردانہ وار جبر کرکے بخوشی رضامندی دے دی ہمارے تمام خاندان میں وہ سب سے پہلی ماں تھیں جنھوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو اس قدر چھوٹی عمر میں محض ان کی تعلیم و تربیت کے لیئے اپنے سے علٰحدہ کرکے اس قدر دور بخوشی بھیج دیا۔ اُن دنوں ہمارے خاندان کی اکثر بیبیاں والدہ مرحومہ سے کہا کرتی تھیں کہ تم نے کس طرح اپنے بچوں کو ایسی کم عمر میں پردیس بھیج دیا لیکن والدہ ہمیشہ جواب میں فرمایا کرتی تھیں کہ بچوں کی جدائی سے جو اُن کے دل پر گزرتی ہو اُس سے وہ واقف ہیں لیکن اُن کو کیا حق ہو کہ اپنی ذاتی خوشی اور اطمینان کے لیئے بچوں کی تمام زندگی کو برباد کریں۔ واقعہ یہ ہو کہ جب کبھی وہ ہمارے متعلق خواب دیکھ لیتی تھیں اور جب کبھی ہمارے پاس سے خط آنے میں دیر ہوتی تو کئی کئی روز وہ راتوں کو جاگتی اور سخت پریشان رہتی تھیں مگر باوجود اس کے ہماری بہبودی اور ترقی کے وہ کبھی سدراہ نہیں ہوئیں حقیقی معنوں میں اُن کی مادرانہ شفقت کا امتحان اور بھی زیادہ اُس وقت ہوا جب کہ تعلیم کے لیئے ہمارے انگلستان جانے کا مسئلہ درپیش تھا

اولاد کی تعلیم کا خاص اہتمام

یہ اُن کی روشن ضمیری اور حقیقی پدرانہ محبت کا سبب تھا کہ ابتدا سے ہماری تعلیم و تربیت کو اُنھوں نے ہر چیز پر مقدم رکھا۔ گو وہ خود انگریزی داں نہ تھے اور ہمارے وطن اور خاندان میں اور نیز اُن ریاستوں میں جہاں کہ والد کی عمر کا زیادہ حصہ گزرا اُس زمانہ میں انگریزی اور جدید تعلیم کو عام طور پر مخالفت اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور گو اُس وقت سر سید علیہ الرحمہ اور اُن کا نیچری گروہ ملک اور قوم میں لامذہب مشہور تھے باایں ہمہ ہمارے والد نے ہم کو ابتدا سے مدرستہ العلوم علی گڈھ میں تعلیم دلائی۔ سب سے اول ۱۸۷۸ء میں جب کہ خود مدرستہ العلوم کی عمر تین سال سے بھی کم تھی ہم کو مدرستہ العلوم میں داخل کیا اور باوجود غیر معمولی محبّت کے ہماری جدائی کو گوارا اور علی گڈہ کے اخراجات کو برداشت کیا۔ ہم کو خوب یاد ہے اُس زمانہ میں جب کبھی والد وطن تشریف لے جاتے تو خاندان اور بستی کے لوگ اکثر اُن کو مشورہ دیتے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے جائداد خریدیں کیونکہ ہمارے خاندان اور وطن کے بزرگوں کے ذہن میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) عرصے سے ہم والد مرحوم سے خواہش کر رہے تھے کہ تعلیم کے لیے وہ ہم کو انگلستان بھیجیں لیکن بقدر زمانہ کے لیے اپنے سے علحدہ کرنا اُن کو سخت ناگوار تھا آخر کار اُنھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر تم اپنی والدہ کو رضامند کر لو تو پھر اُن کی کچھ عذر نہ ہوگا چنانچہ ہم نے والدہ صاحبہ سے کہا اور جب ہم نے اُن کو سمجھا دیا کہ وہاں کی تعلیم اور قیام سے ہماری قابلیت پر صحت اور آئندہ ترقی پر کس قدر زیادہ مفید اثر ہوگا تو فوراً اُنھوں نے بطیب خاطر ہم کو اجازت دے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوش نصیبی اور نعمت نہیں کہ وہ ایسے والدین کے یہاں پیدا ہو جو روشن ضمیر اور صلح ہوں۔ اس امر میں جس قدر خوش نصیب ہم اپنے آپ کو تصور کرتے ہیں اُس کے لیئے خالق ذوالجلال کا شکر ادا کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ جس طرح تمام خاندان میں ہمارے والد غیر معمولی طور پر دانشمند اور دوربین تھے اُسی طرح ہماری والدہ سمجھدار اور روشن خیال تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے قومی افلاس اور کمی تعلیم کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بچوں کی پیدایش کے وقت سے شادی تک محض رسوم اور تقاریب پر حیثیت سے زیادہ خرچ کر دیا جاتا ہے اور تعلیم پر صرف کرنا نہ ضروری سمجھا جاتا ہے اور نہ اُس کے لیئے فضول اخراجات کی وجہ سے کافی سرمایہ باقی رہتا ہے۔ اکثر قرض لیکر بھی چھٹی، ختنہ، منگنی شادی وغیرہ کی رسوم میں اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ بچوں کی ماؤں کے حوصلے اسی طرح پورے ہوتے ہیں۔ اُن کی تمناؤں اور مرادوں کا معیار یہ ہوتا ہے کہ برادری میں سب سے زیادہ ڈھول ڈھمکا ناچ رنگ اور کھانا کھلانا ہو اور اُن کی زندگی کا سبب سے بڑا نصب العین یہ

دیہات یا جاہات سب سے بڑی چیز اور ریاست کی علامت خیال کیئے جاتے تھے مگر والد نے ہمیشہ اُن کو یہ جواب دیا کہ میں اپنے لڑکوں کے لیئے ایسی جائداد پیدا کر رہا ہوں جو لازوال ہوگی اور جس کے سامنے اراضی اور رقبہ جات کی کچھ حقیقت نہیں چنانچہ خدا کے فضل سے آج جو کامیابی یا ثروت ہم کو حاصل ہے یہ بہت کچھ والد کی دور اندیشی، حقیقت بینی اور ایثار کا نتیجہ ہے۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ چند دیہات یا علاقے اولاد کے لیئے چھوڑنا اور تعلیم و تربیت سے غفلت کرنا اس سے زیادہ اولاد کے ساتھ دشمنی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جائداد کے سہارے سے اولاد کاہل اور کم ہمت ہو جاتی ہے اور اس قسم کا بھروسہ اور سہارا ہمیشہ اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے سدراہ ہوتا ہے اس کے علاوہ جائداد کی تقسیم اور انتظام کے متعلق طرح طرح کے جھگڑے آپس میں ہوتے ہیں اور کارندے چند روز میں آمدنی اور خرچ کو برابر کر دیتے ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک یا دو نسلوں کے بعد اس قسم کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) ہوتا ہے کہ بیٹے کا سونے کا سہرہ دیکھیں اور دُلھن بیاہ کر لائیں۔ اس قسم کے خیالات تیس چالیس برس پیشتر اور بھی زیادہ تھے۔ فی الحقیقت ان تمام امور میں بچوں کی فلاح و بہبود کا ماؤں اور قریبی رشتہ داروں کو کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ وہ یہ سب کچھ اپنی دیرینہ اُمنگیں پوری کرنے کے لیئے کرتے ہیں۔ اُن کے دلوں کے حوصلے نکلنے کا اولاد ایک ذریعہ اور آلہ ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی مجالس میں شرکت تفریح اور اپنے ہم جنسوں کی سوسائٹی کے لیئے خواہش ایک قدرتی جذبہ ہے جس سے ہماری عورتیں آزاد نہیں ہیں چونکہ ہماری سوسائٹی کا نظام ایسا ہے جس میں عورتوں کو اس قسم کے مواقع بہت کم ملتے ہیں اس لیئے ان کے تمام حوصلے بچوں کے متعلق تقاریب میں نکلتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے ہماری والدہ مرحومہ مستثنےٰ تھیں ان کو نہ کبھی چھٹی پر خرچ کرنے کا ولولہ ہوا اور نہ اور تقاریب پر روپیہ ضایع کرنے کا شوق کبھی پیدا ہوا۔ اُنھوں نے تقریبیں کیں اور اُن پر خرچ بھی کیا لیکن تین باتوں کا ہمیشہ اُن کو خیال رہا۔ اول تو فضول اور غیر ضروری خرچ اُنھوں نے کبھی جائز نہیں رکھا۔ دوسرے اپنی حیثیت سے زیادہ کبھی خرچ اُنھوں نے نہیں کیا۔ تیسرے ہماری تعلیم اور اس کے متعلق خرچ کو ہر چیز پر مقدم رکھا اس لیئے ہماری تعلیم کے معاملے میں وہ ہمیشہ والد مرحوم کی ممد اور ہم آہنگ رہیں۔ والدہ کے سبب سے والد کو کبھی خرچ کے متعلق کوئی دقت نہیں ہوئی۔ والدہ نے اپنی ذات پر یا اپنی ہمعصر بیویوں میں نام آوری حاصل کرنے کے لیئے کبھی خرچ نہیں کیا وہ فرمایا کرتی تھیں کہ جب ہم میں سے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو چونکہ اُن سے پیشتر جس قدر ہمارے بھائی بہن ہوئے تھے وہ سب مر چکے تھے اس لیئے ہم میں سے بڑے بھائی کے پیدا ہونے کی تمام گھرانے کو بہت

جائداد تباہی اور فلاکت کا باعث ہو جاتی ہے۔ ان وجوہ سے والد نے جائداد کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور جو کچھ پس انداز ہوا اُس کو اُنھوں نے ہماری تعلیم اور تربیت پر نہایت فراخدلی کے ساتھ صرف کیا۔ اُن کی جو کچھ آمدنی تھی وہ صرف ماہانہ تنخواہ تھی جس پر کنبے اور قریبی غریب رشتہ داروں کا سارا بار تھا لیکن اُنھوں نے اپنی ذاتی ضرورتوں اور اخراجات کو ہمیشہ ایک خاص حد کے اندر رکھا اور ہم کو مدرستہ العلوم علی گڑھ میں روسا اور دولت مندوں کے بچوں کے برابر اور ہم پلہ رکھا اس سے اُن کی روشن ضمیری، ہمت اور کیریکٹر کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اہل خاندان سے سلوک اہل خاندان اور رشتہ داروں کے ساتھ جو اُن کا برتاؤ تھا اُس کی یاد اور مثال ہمارے خاندان میں ہمیشہ زندہ رہنے کے قابل ہے۔ ہمارے علم میں کبھی کسی رشتہ دار یا اہل خاندان یا بستی سے کسی معاملہ میں اُن کا کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور اُن سے کبھی کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہونچی بلکہ بڑے حصّہ کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہونچا۔ جو اُن کے قریبی رشتہ داروں میں اہل حاجت تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) زیادہ خوشی ہوئی قریبی رشتہ دار بی بیوں نے اصرار سے والدہ سے کہا کہ وہ چھٹی نہایت دھوم سے کریں لیکن چونکہ اُس زمانہ میں والد کی آمدنی بہت کم تھی والدہ نے صاف کہہ دیا کہ اُن کے پاس اس قسم کی تقریب کے لیئے خرچ کرنے کے لیئے نہیں ہے۔ اس پر چند قریبی رشتہ داروں نے از خود قرض دینا چاہا لیکن والدہ نے قرض لیکر خرچ کرنے سے قطعًا انکار کر دیا اور کسی قسم کی رسم نہیں کی یہی اصول تمام عمر اُن کا رہا۔ اُنھوں نے اپنی ذاتی آرائش و آرام کا کبھی خیال نہیں کیا اور اُن کی زندگی آخر عمر تک نہایت سادہ رہی۔ زیور یا لباس کے ذریعہ سے ہمعصر بی بیوں میں امتیاز حاصل کرنے کا اُن کو کبھی شوق نہیں ہوا لیکن ہماری تعلیم و تربیت اور فلاح کے لیئے اُن کا نصب العین ابتدا سے آخر تک اعلےٰ اور ارفع رہا اور اس لحاظ سے وہ تمام خاندان کی بیبیوں میں ممتاز تھیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ پس ہماری بہت بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ہمارے والدین نہ صرف ہم پر جاں نثار تھے بلکہ عالی خیالی، روشن ضمیری، دور بینی، اور ذاتی ایثار کے لحاظ سے تمام خاندان میں مستثنےٰ تھے اور اُن کی مشفقہ توجہ اور کوشش سے ہم کو خدا کے فضل سے وہ نعمت نصیب ہوئی جس کے لیئے مدت العمر ہم اُن کے دل سے ممنون احسان رہیں گے۔

اُن کی کفالت اُنھوں نے عمر بھر کی۔ جب اُن کی اپنی آمدنی کم تھی اُس وقت بھی وہ اپنی حالت کے مطابق سلوک کرتے رہے اور جب خدا کے فضل سے اُن کو ثروت حاصل ہوئی اُس وقت نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اُنھوں نے سب کی مدد کی۔ متعدد غریب رشتہ داروں کے ماہانے مقرر تھے۔ اُن میں سے جو اب زندہ ہیں اُن کے ابتک جاری ہیں۔ نہ صرف رشتہ داروں کو بلکہ بستی میں غربا کو اُن سے بہت فیض تھا۔ سال بھر کے بعد جب کبھی وہ رخصت پر وطن تشریف لے جاتے تو بستی کے لوگوں کو نہایت خوشی ہوتی تھی یہاں تک کہ اکثر لوگ سال بھر تک اُن کے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ شریف غربا کو وہ جو کچھ دیتے تھے چھپا کر دیتے تھے تاکہ اوروں کی نگاہ میں وہ خفیف نہ ہوں۔ قصبہ میں جس قدر جذامی، نابینا، لولے، لنگڑے، لاوارث یتیم یا معمر ضعیف محتاج ہوتے تھے اُن کو مانگنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ والد ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے محتاجوں کو بغیر مانگے دینا ہر ایک تندرست اہل زر کا فرض ہے۔

مذکورہ بالا مختصر بیان سے ظاہر ہے کہ والد مرحوم کا بی بی بچوں، رشتہ داروں اور بستی والوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ اور تعلق تھا۔ اُن کی زندگی کے جو عام اصول تھے اور اُن پر وہ جس طرح عامل تھے اس کا اندازہ ذیل کے حالات اور واقعات سے ہو سکے گا۔

نوکروں کے ساتھ طرز عمل والد مرحوم کا طرز عمل اپنی بی بی اور بچوں کے ساتھ تھا اُس کا مختصر ذکر کیا جا چکا۔ بی بی اور بچوں کے ساتھ عمدہ سلوک تو غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن ہندوستان میں نوکروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کمیاب ہے۔ وفاداری اور وضعداری والد مرحوم کی فطرت میں داخل تھی چنانچہ ملازموں کے ساتھ بھی اُن کا یہی طرز عمل تھا۔ اُن کے سب سے پرانے ملازم داروغہ عظیم الدین مرحوم تھے۔ وہ ٹونک کے رہنے والے ایک شریف خاندان سے تھے۔ اُن کی عمر صرف بارہ تیرہ سال کی تھی جب کہ والد نے اُن کو ملازم رکھا۔ جب تک والد ٹونک میں رہے داروغہ عظیم الدین اُن کے پاس رہے اور جب والد ترک تعلق کر کے ٹونک سے وطن تشریف لائے تو گو اُس وقت داروغہ عظیم الدین کی عمر کم تھی لیکن اُن کو والد سے ایسا اُنس اور تعلق ہو گیا کہ اُنھوں نے اپنا وطن چھوڑا

اور والد کے ساتھ چلے آئے۔ ہم دونوں کو اُنھوں نے گود میں کھلایا۔ ہمارے سچے بہی خواہ اور وفادار آخر عمر تک رہے۔ وہ خاندان کے ایک رُکن کے مثل تھے۔ والد کے انتقال تک اُن کے پاس رہے اور اُس کے بعد ہمارے پاس تقریباً پچپن سال کی ملازمت کے بعد ہمارے پاس علیگڑھ میں اُن کا انتقال ہوا اور والد مرحوم کے مزار کے قریب ہی وہ علی گڈھ میں دفن ہیں۔ جو اُن کی تنخواہ تھی وہ اُن کی بیوہ کو اب تک دی جاتی ہے اور اُن کے خاندان کے ساتھ جو مراعات تھیں وہ ابھی تک جاری ہیں۔ غرضکہ نہ صرف زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی داروغہ عظیم الدین نے والد مرحوم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بات یہ ہے کہ ملازم بھی صحیح معنوں میں وفادار اُسی وقت ہوتا ہے جب کہ آقا بھی وفادار ہو اور ملازموں کے ساتھ اُس کا برتاؤ شریفانہ اور محبت کا ہو۔ ہم نے والد مرحوم کو کبھی کسی نوکر کو مارتے یا گالی دیتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ گالی یا فحش کلامی تو ہم نے کبھی کسی قسم کی اُن کی زبان سے نہیں سُنی۔ اگر کسی غلطی پر وہ کبھی غیر معمولی طور پر کسی ملازم پر خفا ہوتے تھے تو اُس کے بعد ضرور کچھ نہ کچھ انعام دیتے تھے۔ نوکر اُن کو صرف اپنا آقا نہیں سمجھتے تھے بلکہ برتاؤ کی بنا پر اُن کو اپنا مربی اور بزرگ تصور کرتے تھے۔ تجربہ سے وہ جانتے تھے کہ اُن کی خطائیں ضرور معاف کر دی جاتی ہیں۔ اُن کی بہبودی اور فلاح کا اپنے عزیزوں کے برابر والد خیال رکھتے تھے۔ غرضکہ نوکروں کے ساتھ بھی وہ پورے طور پر وفادار اور صادق تھے۔

وضعداری اور یک رنگی والد مرحوم کی طبیعت میں نباہ اور وضعداری بہت زیادہ تھی جس سے جس قسم کا تعلق ایک مرتبہ ہو گیا اُس کو آخر تک وہ نبھاتے تھے۔ مثلاً جب وہ گوالیار اول مرتبہ تشریف لے گئے تو شروع میں حکیم احسان علی صاحب کے مکان میں مقیم ہوئے اور حکیم صاحب ہی کے توسط سے اول مرتبہ دیوان صاحب ریاست سے ملاقات ہوئی۔ اس طرح پر حکیم صاحب سے جو تعلق ہوا اُس کو والد مرحوم نے آخر تک نبھایا۔ سوائے مہاراجہ صاحب اور دیوان صاحب کے اور کسی کے مکان پر والد بہت کم جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد حکیم صاحب کی پنشن ہو گئی اور ریاست سے اُن کا تعلق کچھ نہ رہا اور اس سبب سے عام نگاہوں میں اُن کا درجہ اور رُتبہ بیشتر جیسا نہ رہا

برخلاف اس کے والد مرحوم کو برابر ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۸۸ء میں وہ ممبر کونسل آف ریجنسی ہوگئے لیکن بااین ہمہ حکیم صاحب کے ساتھ والد کا ابتدا سے جو برتاؤ تھا اُس میں سرمو فرق نہ آیا گوالیار کے قیام کے زمانہ میں والد ہمیشہ اتوار کے روز حکیم صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے اُسی طرح کونسل کی ممبری کے زمانہ میں حکیم صاحب کی زندگی تک والد برابر اُن کے مکان پر جاتے رہے۔ حکیم صاحب کا ایک پُرانا ملازم تھا جس کو حکیم صاحب کے عروج کے زمانہ میں سب انعام دیتے تھے۔ والد مرحوم جب تک وہ شخص زندہ رہا حکیم صاحب کے بعد بھی اُس کو اُسی طرح عیدین اور دسہرہ کے موقعوں پر انعام دیتے رہے۔

ان کے بچپن اور جوانی کے جو ملنے والے تھے اُن سے آخر تک والد کا برتاؤ ویسا ہی رہا جیسا کہ شروع میں تھا۔ اکثر اُن میں سے بہت معمولی حالت میں تھے لیکن والد جب کبھی وطن جاتے تھے اُن سے اُسی طرح ملتے تھے جیسے کہ پیشتر۔ چونکہ طبیعت میں بے انتہا خودداری تھی اس لئے افلاس اور نکبت کے زمانہ میں بھی اُن کی آن بان ہمیشہ قایم رہی کسی لالچ یا کسی سے دب کر اُس وقت بھی اُنھوں نے اپنے آپ کو کسی کے سامنے ہلکا یا ارزاں نہیں کیا لیکن ابتدائی زمانہ میں جس کسی سے بھی اُن کا تعلق ہوگیا اُس کو ثروت اور اقبال کی حالت میں بھی اُنھوں نے اسی طرح قایم رکھا۔

رحم اور ہمدردی مرحوم کی طبیعت میں رحم بہت ہی زیادہ تھا اور ہر ایک ذی روح مخلوق کے ساتھ اُن کو دلی ہمدردی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کبھی عمر بھر شکار نہیں کھیلے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے لئے نہ کبھی کسی جانور کو ذبح کیا نہ کرایا۔ جان کا اُن کو اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ والدہ مرحومہ کو فالج کا مرض ہوا اور حکیم نے کبوتر کا شوربہ بتلایا۔ مگر والد نے کبوتروں کو اس غرض کے لئے ذبح کرنے کی قطعی ممانعت کی اور ذبح نہیں کئے گئے گوشت کھانے سے پرہیز نہ تھا بازار سے گوشت آتا تھا لیکن خاص اپنے لئے کسی جان کے لینے کے وہ ہمیشہ مخالف رہے۔

غربا اور محتاجین کے ساتھ اُن کو دلی ہمدردی تھی اس لئے وہ ہر حالت میں اور ہر جگہ مساکین کی ہمیشہ خدمت کرتے رہے۔ جب کہ اُن کی آمدنی بہت ہی کم تھی اور مالی مشکلات اپنی معمولی ضرورتوں

کے لیے بھی اُن کو لاحق تھیں اُس وقت بھی اپنی حالت کے مطابق وہ خیرات کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خاندان کے وہ لوگ جن کا گزارہ ریاست سے نہ تھا عموماً نواب صاحب کی ملازمت کیا کرتے تھے۔ پڑھے لکھوں کی اُن دنوں میں پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی تھی چنانچہ والد مرحوم نے بھی اسی مشاہرہ پر دو مرتبہ نواب صاحب کی ملازمت کی۔ اس حالت میں بھی وہ ہر ایک جمعرات کو کوڑیاں خیرات میں دیا کرتے تھے۔ اُس کے بعد جب ٹونک میں وہ ملازم ہوئے تو جس عہدہ پر وہ اول مقرر ہوئے اُس کی تنخواہ بیس روپیہ ماہوار تھی۔ اس وقت وہ پیسے خیرات میں دیا کرتے تھے۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد ٹونک میں اُن کی تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار ہوئی تو اُسی نسبت سے اُن کی خیرات کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا اور آخر کار جب بحیثیت ممبر کونسل آف ایجنسی گوالیار اُن کی تنخواہ بائیس سو روپیہ ماہوار ہوئی تو اُسی کے مطابق اُن کی خیرات کی مد بہت زیادہ ہوگئی اُن کا قول تھا کہ حاتم طائی ہونے کے لیئے قارون ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک انسان اپنی حالت کے مطابق حاتم طائی ہو سکتا ہے۔ فی الحقیقت اُنکی تمام عمر اسی عالی خیالی اور حوصلگی کی زندہ مثال رہی۔ مساکین اور محتاجین کے وہ جہاں بھی رہے ہمیشہ پناہ گاہ رہے لیکن اُن کا طریقہ خیرات محض رسمی اور نمایشی نہ تھا بلکہ خاص اصول کے مطابق تھا۔ وہ ہمیشہ خیرات اُنھیں کو دیتے تھے جن کو فی الواقع وہ امداد کا مستحق سمجھتے تھے۔ مثلاً جذامی اندھے لولے لنگڑے، لاوارث یتیم، بوڑھے، اپاہج غرضکہ وہ افراد جو کسی مرض یا معذوری کی وجہ سے بے بس اور بے کس ہوتے تھے اُن کی بے مانگے مدد کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر پیشہ ور یا مُسٹنڈے بھیک مانگنے والوں کو وہ کبھی کچھ نہ دیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کی مدد کرنے کو وہ مستحقین خیرات کی حق تلفی تصوّر کرتے تھے کیونکہ رسماً یا پیشہ کے طور پر یا کاہلی سے کسب معاش نہ کرنے والوں کو وہ محتاج نہیں سمجھتے تھے۔ جو اُن کے خیال کے مطابق محتاج اور مستحق مدد تھے اُن کو اُن کے مکان پر آنے کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ والد مرحوم عموماً اتوار کے روز شام کی ہوا خوری کے وقت جہاں جہاں ایسے محتاج مانگنے کے لیئے بیٹھتے تھے وہاں خود جا کر اُن کا مقررہ اُن کو

پہونچا دیتے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اکثر ہمارے ہاتھ سے اور ہمارے بچوں کے ہاتھ سے محتاجوں کو خیرات دلایا کرتے تھے۔ ہم اپنے بچپن میں یا ہمارے بچے جب کبھی از خود کسی محتاج کو کچھ دیتے تو والد نہایت ہی خوش ہوتے تھے اور گھر میں آکر والدہ سے نہایت مسرت کے ساتھ ذکر کرتے کہ آج فلاں بچے نے بغیر کہے خیرات کی۔ وہ اس طرح پر محتاجین کی مدد کا سبق اپنے عمل سے ہمارے دلوں میں بٹھاتے تھے جو ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ والد مرحوم کے دل میں خیرات کی بڑی قدر و قیمت تھی اور اپنی تصانیف میں جگہ جگہ اپنے اس عقیدہ کو اُنھوں نے بیان کیا ہے۔ آئندہ زندگی میں انسان کو اپنے خالق کی حضور میں جو جوابدہی کرنی ہے اُس کو اپنی مشہور نظم "سیر باغ" میں بیان کرتے ہوئے خیرات کی نسبت حسب ذیل اشعار لکھے ہیں ؎

پشیماں ہو گزشتہ غفلتوں سے اب نہ سویا کر ... وہاں تو پائے عزت ایسا کچھ ساماں مہیا کر
حضورِ شاہ میں تا سرخرو ہو جائے تو جا کر ... بھرے بازار میں آیا ہے تو پُر نفع سودا کر

مکرم جنس یاں ہے دستگیری نیم جانوں کی
خریدا کر ملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں ؎

تجھ کو اس میلے میں گر پر نفع سودا چاہیئے
شوق استرضائے خلاقِ تو انا چاہیئے
ہو اگر دل کو شکر خندہ طرب کی آرزو
غیر کے آنسو یدِ شفقت سے پونچھا چاہیئے
اندمالِ زخم ناکامانِ بے کس کے لیئے
مرہمِ کافور ہمدردی کا پھاہا چاہیئے
منعموں سے کہتے ہو حاضر پئے خدمت ہیں ہم
بے کسوں سے بھی کبھی پوچھا کرو کیا چاہیئے

اولوالعزمی

اولوالعزمی کے لیے محنت اور جفاکشی لازمی شرط ہیں۔ والد مرحوم فطرتاً اولوالعزم پیدا ہوئے تھے اس لیے تمام عمر وہ جفاکش اور مشکلات کا مقابلہ محنت اور کوشش سے کرتے رہے۔ ناکامی سے کبھی اُنھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ابتدائی حالات میں بیان کیا جاچکا ہو کہ ایک مرتبہ نواب کنجپورہ کی ملازمت ترک کرکے تلاش معاش میں اُنھوں نے سفر کیا لیکن ناکام رہے اور واپس آئے۔ مگر پھر دوبارہ گئے اور بہت کچھ تکالیف برداشت کرنے کے بعد آخرکار کامیاب ہوئے اور ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہونچے۔ اول مرتبہ جب ناکام ہوکر وہ وطن واپس آئے تو ان کے بزرگوں اور دوستوں نے ان کو نصیحت کی کہ وہ کنجپورہ کی نوکری پر قناعت کریں اور بے سود باہر نہ جائیں لیکن جن طبیعتوں میں فطرتی اُبھار اور اُپج ہوتی ہو وہ عارضی ناکامیوں سے کب گھبراتے ہیں۔ کچھ دن تک قیام کرنے کے بعد والد نے پھر سفر کیا اور ہر ایک قسم کی بے سروسامانی کے ساتھ محنت جفاکشی اور استقلال کی بدولت منزل مقصود پر آخرکار پہونچے۔

مرحوم نے جفاکشی اور محنت کی نسبت ایک نظم میں اپنے خیالات کو ذیل کے اشعار میں بیان کیا ہو:-

کاہل نہیں طامع نہیں نامرد نہیں ہم ۔۔۔ بیکار پڑے رہنے سے دل سرد نہیں ہم
دیں اور کو تکلیف وہ بیدرد نہیں ہم ۔۔۔ ہیں مرد جفاکش کوئی شب گرد نہیں ہم

محنت سے جو پابندیِ اوقات کریں گے
کس واسطے پھر ایسے خیالات کریں گے

بیکار وہ دن زیست کے دنیا میں گزارے ۔۔۔ محتاج جو ہو جائے کسی درد کے مارے
یا یہ کہ گیا ہو یمِ ہستی کے کنارے ۔۔۔ کچھ کر نہ سکے قوت بازو کے کنارے

مردانِ اُولوالعزم تو بیکار نہ بیٹھیں
اوروں کے بھروسہ پہ زنہار نہ بیٹھیں

کیا ناز ہی ہم خود تو یدو پا نہ ہلائیں اوروں کی مشقت سے جو پیدا ہو وہ کھائیں
صد حیف ہی غیرت کو اگر کام میں لائیں اک چلّو بھرے پانی میں کیوں ڈوب نہ جائیں

وہ کونسا عقدہ ہی جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

پابندیِ ناموس ہی کار اہل حیا کا نگرانیِ افعال ہی شیوہ عقلا کا
لغزش نہیں کرتا قدم ارباب صفا کا انداز پسندیدہ ہی مردانِ خدا کا

ہر صورتِ خوش دیکھ کے کرتے نہیں آہیں
قبضے میں جگر رکھتے ہیں قابو میں نگاہیں

ہر حال کے وارفتہ و شیدا نہیں ہوتے ہر شوخ سے سرگرم تمنا نہیں ہوتے
در در صفتِ نقش کفِ پا نہیں ہوتے ہر جائی نہیں بنتے ہیں رسوا نہیں ہوتے

دل پر بھی نہ قابو ہو تو مردانگی کیا ہی
اتنی بھی نہ ہو عقل تو فرزانگی کیا ہی

خودداری والد مرحوم کے کیرکٹر میں خودداری اس درجہ تھی کہ اُن کو کسی کا ممنون احسان ہونا سخت ناگوار ہوتا تھا۔ عمر بھر میں بہت ہی کم لوگ ایسے تھے جن سے اُنھوں نے کوئی استفادہ حاصل کیا ہو۔ ہمیشہ تکالیف برداشت کیں اور مشکلات کا سامنا کیا مگر حتی الامکان دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے سے قطعی احتراز کیا۔ ان امور میں اُن کا جو اصول اور طرز عمل تھا اُس کو اُنھوں نے اپنے ایک مضمون میں جو بعنوان "عصائے ہمت" صبح نور میں طبع ہوا ہی بیان کیا ہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ "مرد وہ ہی کہ گو اپنی حالتِ فلاکت میں گھاس کاٹ کر بسر اوقات کرتا ہو مگر گنج قاروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے بلکہ اپنے پسینے کی کمائی میں سے بقدر امکان دوسروں کی مدد کرنے کا ارادہ کرے۔ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہی کہ حاتم طائی کے زمانہ میں جو ایک مشہور فیاض گزرا ہی ایک روز حاتم کی دولت سرا میں عام دعوت تھی

اور بہت عمدہ اور نفیس کھانے پکائے گئے تھے۔ ہر طرف سے جوق جوق لوگ شریک دعوت ہوتے تھے۔ حاتم کے ملازمین راستوں اور سڑکوں پر مسافرین کی تلاش میں پھرتے تھے۔ ایک شخص لکڑیوں کا گٹھا جنگل سے فروخت کے واسطے لئے آرہا تھا۔ تکان اور دھوپ سے پیشانی کا پسینہ ایڑی تک بہتا تھا۔ تلاش کرنے والوں نے بہت شوق سے اُس کا استقبال کیا اور حاتم کی دعوت میں شریک ہونے کی بشارت دی لیکن اُس عالی ہمت نے کمال جوانمردی سے کہا کہ مجھ کو تندرستی کی حالت میں حاتم کا احسان اُٹھانا پسند نہیں ہے۔ میں بقدر اپنے مقدور کے خود حاتم ہوں اسی لکڑیوں کے گٹھے کو فروخت کرکے اپنا بھی گزارہ کروں گا اور ایک مناسب حصہ کسی محتاج کو دونگا۔ ملازمین حاتم نے کہا کہ آج اگر حاتم کی دولت سرا پر چلنا منظور نہیں تو کل تکلیف کیجیے۔ اُس نے کمال مردانہ ناز کے ساتھ گوشہ ابرو کو کج کرکے پھر جواب دیا کہ کیا میری یہ ہمت جس پر بھروسہ کرکے میں نے خود کو بھی حاتم کہا ہے صرف ایک روزہ ہے۔ کیا میں کل بدہمت ہو جاؤنگا نہیں بلکہ میری ہمت جواں مردوں کے مانند مستقل اور دائمی ہے۔ کبھی خود کو محنت سے معاف نہ کروں گا نہ کبھی مجھ کو حاتم کے در پر جانے کی ضرورت ہوگی'' والد مرحوم کی زندگی میں بھی ہم کو اسی قسم کی اُولوالعزمی بلند حوصلگی کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں۔ عالی خیالی اور خودداری کی والد مرحوم مجسم اور زندہ مثال تھے۔ اس خصوص میں اُن کا جو عمل تھا اُس کو اُنھوں نے اپنے ذیل کے اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

مفلس ہوں تو کچھ غم نہیں ہمت ہے عالی
بلور سے بہتر ہے مرا جام سفالی

ہے نانِ جویں مرغ و مزعفر سے زیادہ
کمل ہے میرا خلعتِ پر زر سے زیادہ

ٹوپی ہے مری تاجِ سکندر سے زیادہ
وسعت میرے گھر کی مجھے کشور سے زیادہ

ہے دولت جاوید پسینے کی کمائی
آئینہ سے اعلیٰ ہے مرے دل کی صفائی

خاندانی اور ابتدائی حالات کے سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ دادا صاحب مرحوم کے

انتقال کے وقت کوئی جائداد نہ تھی اور ہماری شاخ خاندان کی مالی حالت افلاس کے درجے سے کچھ ہی بہتر تھی لیکن باوجود تنگ دستی والد مرحوم نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اپنے پر تکالیف گوارا کیں لیکن کسی کے سامنے اپنے آپ کو ہلکا نہیں کیا۔ اس لحاظ سے ہماری تربیت جس طرح اُنھوں نے کی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ گوالیار کی ملازمت کے زمانہ میں ہمارے بچپن میں مہاراجہ صاحب بالقابہ کے سامنے کبھی ہم کو پیش نہیں کیا۔ ریاستوں میں یہ معمولی بات ہے کہ بڑے عہدہ دار اپنے بچوں کو سلام کے لیئے رئیسوں کے سامنے پیش کرکے کچھ گذارہ وغیرہ جاری کراتے ہیں لیکن والد مرحوم نے ہمیشہ ہم سے فرمایا کہ "میں مہاراجہ کا نوکر ہوں تم نوکر نہیں ہو، تم اپنے گھر میں خود رئیس ہو تم کو سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے سر خم کرنے کی ضرورت نہیں"۔ یہ اسی تربیت کا ثمرہ ہے کہ خدا کے فضل سے آج تک ہم کو کسی انسان کے سامنے سر خم کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی اور کسی ذاتی غرض کے خیال نے ہم کو اظہار حق سے باز نہیں رکھا۔ والد مرحوم کے اس طرز عمل سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ وہ مغرور یا مدمغ تھے۔ یہ واقعہ نہیں ہے۔ اُنھوں نے ایک مضمون میں اپنے خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ انسان پر تین قسم کے حقوق ہیں۔ اول حقوق خالق، دوم حقوق مخلوق، اور سوم حقوق ذات خود، چنانچہ ہم پر اپنی ذات کا یہ حق ہے کہ ہم اُس کو عارضی اغراض در لالچ کے لیئے کسی کے سامنے ذلیل و خوار نہ کریں۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال قابل ذکر ہے۔ ریاستوں میں عام دستور ہے کہ ماتحت عہدے دار بڑے افسروں کے گھروں پر حاضر ہو کر دربار داری کرتے ہیں۔ خاص مواقعہ پر تحائف دیتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے اُن کو خوش رکھنے کی فکر کرتے ہیں، لیکن والد مرحوم کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ یا تو وزیر ریاست کے گھر پر مقررہ اوقات پر اپنے کام کی اطلاع کے لیئے جاتے تھے یا اتوار کے روز حکیم احسان علی صاحب کے مکان پر جاتے تھے جن سے سب سے اول اُن کی ملاقات گوالیار میں ہوئی تھی۔ اور جن کے تعرف سے والد گوالیار میں ملازم ہوئے تھے چنانچہ جس زمانہ میں حکیم صاحب موصوف کی پنشن ہوگئی اور ریاست سے کچھ تعلق نہ رہا اُن کے انتقال کے وقت تک والد برابر اتوار کے روز اُن کے مکان پر جاتے رہے۔ اس کے

علاوہ والد اور کسی بڑے افسر کے مکان پر نہیں جاتے تھے۔ یہ طرزِ عمل نائب دیوان صاحبان صیغہ مال و فوجداری کو خاص طور پر ناگوار تھا اور جب والد ضلع عیسے گڈھ کے صوبہ ہوئے تو مالی اور فوجداری کے کاموں میں وہ اِن دونوں نائب دیوان صاحبان کے ماتحت ہوئے۔ اُس حالت میں بھی جب کبھی والد گوالیار تشریف لاتے تو ان دونوں نائب دیوان صاحبان کے مکان پر نہیں جاتے تھے۔ اس لیئے یہ دونوں افسر اپنی ناخوشی کا اظہار مختلف شکلوں میں کئی سال تک کرتے رہے۔ چونکہ والد کا کام ہر لحاظ سے عمدہ اور صاف تھا اور خود مہاراجہ صاحب ان کی قابلیت اور خدمات سے واقف تھے اس لیئے اِن کی ملازمت کو کچھ نقصان نہیں پہونچا۔ تاہم مختلف طور پر اُن کو مشکلات اور تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا اور گو اُن کو اکثر مشورہ دیا گیا کہ وہ نائب دیوان صاحبان کے مکان پر جاکر اپنی صفائی کرلیں یہاں تک کہ خود اُن اصحاب کی طرف سے اس قسم کے پیام آئے لیکن والد مرحوم ماتحتی کے زمانہ میں کبھی اُن کے مکان پر نہیں گئے مگر ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ کا انتقال ہوا اور کونسل آف ریجنسی قایم ہوئی جس میں والد مسلمان ممبر مقرر ہوئے اور صیغہ فوجداری اُن کے سپرد ہوا اور جو صاحب نائب دیوان فوجداری تھے اور صوبات کے زمانہ میں والد مرحوم کے افسر تھے وہ کونسل کے زمانہ میں براہ راست والد کے ماتحت ہو گئے افسر ہوتے ہی سب سے اول کام جو والد نے صیغہ فوجداری کے متعلق کیا وہ یہ تھا کہ وہ نائب دیوان صاحب کے مکان پر اول خود تشریف لے گئے اور اُن کو اطمینان دلایا کہ اُن کی طرف سے ان کو یعنی نائب دیوان صاحب کو گزشتہ تعلقات کی بنا پر کسی قسم کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے چنانچہ والد نے کبھی ان کی مخالفت نہیں کی اور نائب دیوان صاحب ہمیشہ ان کے ممنون اور اُن کے اس غیر معمولی برتاؤ کے معترف رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد مرحوم کبھی کسی کو نقصان نہیں پہونچانا چاہتے تھے یہاں تک کہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی اُنھوں نے کبھی انتقامانہ برتاؤ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو اپنی حفاظت اور مخالفوں کے حملہ کی مدافعت کے لیئے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے لیکن انتقام کے خیال سے کسی کے

ساتھ برائی نہ کرنا چاہیئے چنانچہ اُن کی تمام عمر اسی طریقہ عمل کی زندہ مثال رہی۔

انصاف و دیانت انسان کی اخلاقی کمزوریوں میں خود غرضی کو خاص امتیاز حاصل ہے کیونکہ شیطان اُس کے ذریعہ سے مختلف شکلوں میں انسان کو مفتوح اور پامال کرتا ہے۔ زندگی میں ہر جگہ اور ہر موقعہ پر اس دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور اگر بچپن سے انسان صداقت اور فراخ دلی اور قوت ضبط کے ہتھیاروں سے مسلح نہ ہو تو قدم قدم پر اُس کے لیے خطرہ اور اندیشہ ہے اور گو وہ کتنا ہی قابل اور مستعد کیوں نہ ہو انجام کار اُس کو حقیقی کامیابی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ پس ابتدائے عمر سے بچوں کو عملاً سچ، دیانت اور فیاضی کی اخلاقی خوبیوں سے مانوس کرنا اور غیر محسوس طریقہ سے اُن کی عادتوں اور مذاق کو اسی سانچے میں ڈھال دینا تربیت کے لئے بہترین طریقہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا اعلیٰ ترین ذریعہ اور آلہ خود والدین کا اخلاق اور طرز عمل ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے بھی جو احسان ہمارے پیارے ابا جان کا ہم پر ہے اُس کا اعتراف ہمارے امکان میں نہیں کیونکہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا سوائے صداقت، دیانت، انصاف، حق پرستی کے اپنے گھر میں ہم نے نہ اور کچھ دیکھا نہ سُنا۔ والد مرحوم جہاں کہیں رہے دیانت اور انصاف میں ہمیشہ مشہور رہے۔ ٹونک اور ریاست گوالیار میں آج تک اُن کی دیانت اور انصاف ضرب المثل ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو لاکھوں روپیہ رشوت میں لے سکتے تھے لیکن اُن کی دیانت اس درجہ کی تھی کہ اُن کے دشمن سے دشمن نے کبھی اُن کی نسبت شبہ تک نہیں کیا کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ جرات بھی نہیں ہوئی کہ ڈالی تک پیش کر سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ انصاف کے معاملہ میں اُن کے سامنے اہل معاملہ کوئی بھی ہو، ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا یہودی، غرضکہ انصاف کے وقت اُن پر رشتہ یا مذہب یا قومیت کا کبھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صداقت اور انصاف کا انحصار حالت معاملہ یا واقعہ پر ہونا چاہیئے نہ کہ مذہب و ملت پر۔ خود مذہب کی صداقت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ بلا لحاظ کسی قسم کے رشتہ یا تعلق کے حق اور انصاف کا حامی اور مددگار ہو۔ چنانچہ والد کا انصاف او اُن کی بے لوث دیانت اس درجہ کے تھے کہ ضلع علیگڈھ کی رعایا کے لوگ کہا کرتے تھے کہ نواب صاحب

انسان نہیں ہیں بلکہ اوتار ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ والد مرحوم کے طرز عمل کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ انسان میں انصاف یا دیانت کے خلاف کوئی کمزوری بھی ہو سکتی ہے۔ اس سبب سے ابتدا سے ہمارے ذہنوں میں رشوت یا ظلم یا خود غرضانہ طرف داری ایسی محبوب چیزیں ہو گئیں کہ فطرتی طور پر ہم کو اُن سے نفرت اور مغائرت ہو گئی جس کی وجہ سے ہم کو عملی زندگی میں بہت بڑی تقویت اور آسانی حاصل ہے۔ والد مرحوم نے اپنے اس طرز عمل کو ایک نظم میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے؎

ہم مرد ہیں غیروں کا سہارا نہیں لیتے　　پیراک ہیں دریا کا کنارا نہیں لیتے
جو شیر ہیں صید اور کا مارا نہیں لیتے　　ہو آہوئے مشکیں کہ چکارا نہیں لیتے
لالچ کی نگاہوں سے نظر تک نہیں کرتے
اس راہ دنائت سے گذر تک نہیں کرتے

ہم دولت قاروں کے لئے جھوٹ نہ بولیں　　اور ملک فریدوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں
عشق لب میگوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں　　یا دِ قدِ موزوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں
اندوختۂ غیر کو چھونے سے غرض کیا
مردوں کے لئے خواہشِ بیجا کا مرض کیا

جو مرد ہیں رشوت نہیں لیتے نہیں دیتے　　یہ مزدِ دنائت نہیں لیتے نہیں دیتے
کو بِن کی نکہت نہیں لیتے نہیں دیتے　　انصاف کی قیمت نہیں لیتے نہیں دیتے
رہتے ہیں ہر اک حال میں انصاف کے پابند
آئینہ کی صورت ہیں دلِ صاف کے پابند

مذکورہ بالا اشعار میں والد مرحوم نے خود اپنے طرز عمل کی بالکل سچی تصویر کھینچی ہے۔ اون کی صداقت اور دیانت فرایض منصبی ہی تک محدود نہ تھے بلکہ زندگی کی ہر حالت میں ان کا عملی ظہور ہوتا رہتا تھا۔ جب کہ والد وطن تشریف لے جایا کرتے تھے اُس زمانہ میں ہمارے وطن کی شہر پناہ کے دروازوں پر چنگی کی چوکیاں تھیں جہاں باہر سے سامان لانے والوں سے محصول لیا جایا کرتا تھا

والد جب کبھی وطن تشریف لاتے تو ہمیشہ دروازہ پر سواری کو رکوا کر چنگی کے محرر کو بلاتے اور جو سامان اُن کے صندوقوں میں محصول کے قابل ہوتا اُس کی تفصیل اُس کو نہایت احتیاط کے ساتھ بتلا دیتے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ سواری نہ رکواتے اور خود محصول کے قابل اشیاء کی فہرست نہ دیتے تو چنگی کے محرروں کی اُن کو روکنے یا اُن سے دریافت کرنے کی جرات نہ ہوتی لیکن وہ فرمایا کرتے تھے کہ دیانت اور صداقت بڑی اور چھوٹی چیزوں میں یکساں ہونا چاہیئے کیونکہ جو لوگ چھوٹی اور معمولی چیزوں میں راہ راست سے انحراف کے عادی ہوتے ہیں وہ پھر بڑے معاملوں میں بھی بھٹک جاتے ہیں بعض اصحاب بڑے معاملوں میں تو پورے طور پر دیانت کا خیال رکھتے ہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کفایت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جب انسان ہزاروں اور لاکھوں روپیہ پر نگاہ نہ کرے تو چند روپیوں کے لیئے اپنی دیانت اور صداقت پر داغ لگانا کیسی غلطی ہے غرضکہ کوئی اہل معاملہ ہو اور چھوٹا یا بڑا کسی نوعیت یا حیثیت کا معاملہ ہو ہر حالت میں وہ انصاف صداقت اور دیانت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے اور اُن پر پورے طور پر عامل رہتے تھے۔

انجام بینی و قوت انتظامیہ والد مرحوم کی طبیعت نہایت انجام بیں اور اعتدال پسند تھی انسان کی طبیعت کا امتحان مشکل اور تکلیف کے وقت ہوتا ہے۔ مذکور الصدر حالات سے ظاہر ہے کہ اُن کی ابتدائی زندگی افلاس اور ناکامیوں میں گذری لیکن ہر حالت میں اُنھوں نے اعتدال مد نظر رکھا اور اپنی خواہشوں اور شوق کو قابو میں اور انجام بینی کے تابع رکھا۔ جب کہ ان کی تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار تھی اُس وقت اُس حالت کے مطابق اُنھوں نے اپنی ضرورتوں کو پورا کیا۔ جب بیس روپیہ ماہوار ہوئی اُسی نسبت سے اُنھوں نے اپنی طرز زندگی میں اضافہ کیا اور اسی طرح جب رفتہ رفتہ سو، پانچ سو، سات سو اور ساڑھے بائیس سو روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ ہوئی اُسی کے لحاظ سے اُن کی ضرورتوں میں وسعت اور اُن کے اخراجات میں اضافہ ہوتا گیا لیکن ہر حالت میں اُنھوں نے اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو اپنے وسائل کی حد کے اندر رکھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کبھی مقروض نہیں ہوئے اور سوائے ایک مرتبہ کے روپیہ کے معاملہ میں کبھی کسی کے ممنون احسان نہیں ہوئے۔ ہماری یاد میں کبھی اُن کو کسی سے

قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ جو کچھ بھی اُن کی آمدنی تھی اُس کے ایک حصّہ کو ہمیشہ اُنھوں نے پس انداز کیا۔ عمر بھر اُنھوں نے اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب خود لکھا۔ اُن کا روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد گذشتہ دن کے کھانے کا حساب باورچی لاکر پیش کرتا تھا وہ اس کو دیکھ اُسی وقت بیباق کر دیتے تھے اور کچھ پیشگی دے دیتے تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ معمول لوگ اکثر معمولی روزانہ خرچ کا حساب لکھنے کے لیے منشی رکھتے ہیں حالانکہ یہ کام صرف چند منٹ کا ہے جو التزام کے ساتھ اگر کیا جائے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابتدا میں وہ ہر رقم کو جو خرچ ہوتی تھی لکھا کرتے تھے بعد کو اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ایک خاص رقم مثل ہزار یا دو ہزار کے وہ صندوق میں رکھتے تھے وقتاً فوقتاً اُس میں سے ماہ بماہ نکال کر اور حساب میں درج کر کے صندوقچے میں رکھ لیتے تھے اور اُس میں سے روزانہ خرچ کے لیے نکالتے رہتے تھے۔ چونکہ اپنے ہاتھ سے نکال کر خرچ کرتے تھے اس لیے خرچ کی تفصیل نہیں لکھتے تھے لیکن جو رقم صندوق میں رہتی تھی اُس کا حساب پورا رکھتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا اُس وقت جو رقم صندوق میں سے نکلی اُس کا پورا حساب اُن کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا اُن کی اس خوش انتظامی اور مآل اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے انتقال کے وقت اُنھوں نے کسی قسم کا کوئی قرض نہیں چھوڑا یہاں تک کہ نوکروں کی تنخواہ بھی بہت کچھ پیشگی ادا ہو چکی تھی اور ہم کو کسی قسم کی وقت اُن کے کسی معاملہ کی نسبت نہیں ہوئی۔ ہر ایک معاملہ بالکل صاف اور صحیح حالت میں اُنھوں نے چھوڑا۔ یہ اُن کی اسی انجام بینی، ضبط نفس اور خوش انتظامی کا سبب تھا کہ باوجود کبھی کسی حالت یا شکل میں ناجائز آمدنی نہ ہونے کے وہ جہاں کہیں رہے عزت اور شان سے رہے۔ اپنے متعلقین اور اولاد کو ہر طرح سے آرام سے رکھا۔ ہم کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم مثل رئیس زادوں کے دلوائی اور غربا اور مساکین کی پوری مدد کی۔

قرض کی معاملت سے احتیاط اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہماری یاد میں والد مرحوم نے کبھی کسی سے قرض نہیں لیا۔ جب کہ وہ معمولی باتوں میں بھی ممنون ہونا نہیں چاہتے تھے تو ظاہر ہے کہ قرض لینے سے جس قسم کا بار انسان کی گردن پر ہوتا ہے اُس کو وہ کیسے گوارا کرتے لیکن اگر اُن میں انجام بینی اور

ضبط نفس کی قابلیت اور قوت نہ ہوتی تو اُن کی خودداری کا قایم رہنا نہایت دشوار تھا۔ یہ اُن کے
کریکٹر کی خصوصیات میں سے تھا کہ جس درجہ کی اُن میں خودداری تھی اُسی نسبت سے اُن میں قوتِ
ضبط اور خوش انتظامی کی قابلیت بھی۔ بغیر ان قوتوں اور قابلیتوں کے محض خودداری کا خیال
نہ صرف بے سود ہی بلکہ طرح طرح کی تکالیف اور ناکامیوں کا باعث ہوتا ہی والد مرحوم کے کریکٹر میں یہ
سب اخلاقی عناصر نہایت صحیح تناسب کے ساتھ موجود تھے جس کے سبب سے اُن کی زندگی صحیح معنوں
میں معتدل اور کامیاب رہی۔

"القرض مقراض المحبت" کے مقولے میں جو حقیقت متمکن ہی اُس کے اقتضا کے مطابق والد مرحوم
حتی الامکان کسی کو قرض نہ دیتے تھے جس کسی کو وہ سمجھتے تھے کہ مدد کی ضرورت ہی وہ ضرور مدد کرتے
تھے لیکن ہمیشہ یہ سمجھ کر کہ اُس کی واپسی کا نہ کبھی تقاضا کریں گے اور نہ خواہش چنانچہ جس کسی کو اُنھوں
نے قرض دیا اُس کے لیئے نہ کبھی تقاضا کیا اور نہ ادا نہونے کی حالت میں کچھ افسوس۔

حصول مقصد کے آئین و اصول والد مرحوم کی طبیعت میں خودداری کا پاس اس قدر
زیادہ تھا کہ حصول مطلب کے لیئے کسی کی خوشامد یا کسی سے کوئی استدعا کرنا اُن کو سخت ناگوار تھا لیکن یہ
ظاہر ہی کہ اس زندگی میں کامیابی کے لیئے دوسرے ہم جنسوں سے سابقہ پڑنا لازمی ہی اور دوسروں
کے خیالات مذاق اور طرز عمل سے متاثر ہونے پر انسان بہت کچھ مجبور ہی۔ چنانچہ والد کو بھی دنیاوی
ضرورتوں کے لیئے دوسروں سے حصول مقصد کے لیئے کام پڑتا تھا۔ اُنھوں نے حصول مقصد کے لیئے
تمام عمر جس اصول اور طریقہ پر عمل کیا وہ خاص طور پر قابل ذکر ہی۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم
کسی سے کوئی مطلب حاصل کرنا چاہو تو سب سے کارگر طریقہ یہ ہی کہ تم یہ معلوم کرو کہ جس شخص سے تم کو کسی
چیز کی ضرورت یا احتیاج ہی وہ کس چیز کا خواہاں ہی پس اگر تم یہ چاہتے ہو کہ وہ تمہارا مطلب پورا کرے
تو تم اُس کے مرض کی دوا یا ضرورت کی چیز کو بہم پہونچانے کی فکر کرو۔ اگر تم ایسا کر سکو تو ضرور اپنی مراد
کو پہونچو گے ورنہ کامیابی آسان نہیں۔ مسئول پر اثر ڈالنے کا کارگر اور باثر طریقہ یہی ہو کہ اُس کے مرض کی دوا
سائل کے قبضۂ قدرت میں ہو۔ والد کے اس اصول اور طریقہ کو واضح کرنے کے لیئے تین واقعات بطور

مثال کے بیان کیے جاتے ہیں۔

ٹونک میں والد مرحوم ابتدا میں صاحبزادہ عبادا للہ خاں صاحب مرحوم کے بیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے تھے لیکن ان کی اصلی خواہش یہ تھی کہ ریاست میں اُن کو کوئی معقول عہدہ ملے اُنھوں نے اس کا پتہ لگایا کہ نواب صاحب ٹونک کو انتظام ریاست کے سلسلہ میں کس مسئلہ کے متعلق زیادہ فکر اور خیال ہے۔ ان کو معلوم ہوا کہ علاقہ سرونج میں بدنظمی کے سبب سے اُس کے انتظام کے متعلق نواب صاحب کو بہت خیال ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر والد نے سرونج کے علاقہ کے حالا دریافت کیئے اور اُس کے انتظام کی نسبت ایک مکمل تجویز لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا دی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب والد کو اپنے ہمراہ سرونج کے دورہ پر لے گئے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سو روپیہ ماہوار پر محکمہ خاص کا افسر مقرر کر دیا۔ ٹونک کی ملازمت کے زمانہ میں نواب صاحب نے والد کو کسی خاص کام کے لیے شملہ بھیجا جس کا تعلق فارین آفس سے تھا۔ اُس زمانہ میں میر منشی کا ایک عہدہ تھا جو نہایت با اثر اور با اختیار تھا۔ مولوی اظہار حسین خاں صاحب نامی ایک صاحب اُس زمانہ میں میر منشی تھے جو نہایت ہی بد مزاج اور کج خلق مشہور تھے اور جن کے دروازہ پر بڑے بڑے رئیس بیٹھے رہتے تھے۔ والد نے شملہ پہونچکر میر منشی صاحب کے حالات دریافت کیئے۔ اُن کو معلوم ہوا کہ میر منشی صاحب کو رمل اور جفر کا بہت شوق ہے۔ رمل اور جفر سے والد خوب واقف تھے چنانچہ پہلی ہی ملاقات میں والد نے رمل اور جفر کا ذکر چھیڑ کر میر منشی صاحب کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ اُنھوں نے والد کو اصرار کے ساتھ اپنے مکان پر مہمان کیا اور جب تک وہاں رہے نہایت تپاک اور خلوص سے پیش آتے رہے اس طرح پر جو بات بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہ تھی وہ محض اس وجہ سے کہ والد کے پاس میر منشی صاحب کی ضرورت کی چیز موجود تھی اُن کو با آسانی حاصل ہو گئی۔

گوالیار میں جب اول مرتبہ تلاش روزگار کے لیئے والد تشریف لے گئے تو وہاں وہ کسی سے واقف نہ تھے۔ اُس وقت مہاراجہ صاحب گوالیار میں تشریف نہ رکھتے تھے اور ریاست کا تمام کام دیوان صاحب دادا صاحب کھڑکے کے سپرد تھا۔ چند روز قیام کے بعد والد نے حالات دریافت

کر کے معلوم کر لیا کہ دیوان صاحب کو سب سے زیادہ فکر ضلع عیسے گڈھ کے انتظام کے متعلق ہی جہاں اُس وقت بہت زیادہ بدامنی اور بدنظمی تھی۔ پس والد نے ضلع عیسے گڈھ کے حالات کی تحقیق کر کے وہاں کے انتظام کے لیئے ایک مفصل رائے لکھی اور حکیم احسان علی صاحب کے ذریعہ سے دیوان صاحب سے مُلاقات کر کے اپنی تجویز ضلع عیسے گڈھ کے انتظام کے متعلق پیش کی۔ اول ہی مُلاقات کے بعد والد مکان پر واپس پہونچے ہی تھے کہ دیوان صاحب کا پیام ملازمت کے لیئے آیا اور اسسٹنٹ دیوانی کے عہدہ پر اُن کا تقرر ہو گیا۔

غرضکہ عمر بھر والد اسی اصول پر کامیابی کے ساتھ عامل رہے اور ہم سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ اصلی خوشامد اور مسئول کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہی کہ جو اُس کا مرض ہو اُس کا علاج بہم پہونچانے کی فکر کرو۔ پادشاہ ہو یا گدا کوئی متنفس ایسا نہیں ہی جس کی کوئی نہ کوئی احتیاج یا ضرورت نہ ہو پس اگر تمہارے پاس اُس کے مطلب کو پورا کرنے کا نسخہ ہی تو تمہاری مراد پوری ہوگی ورنہ کامیابی یقینی نہیں۔

احسان شناسی والد مرحوم جہاں کہیں رہے اُن کے محسنوں کی تعداد بہت کم ہی لیکن جب کبھی بھی اُن کو کسی سے کچھ بھی مدد ملی اُس کے احسان کو وہ کبھی نہیں بھولتے تھے اور طرح طرح سے اُس کا اعتراف اور بدل کرتے رہتے تھے۔

جس زمانہ میں وہ فوج میں ملازم تھے اُن کو شروع میں گھوڑے کی سواری اچھی طرح نہ آتی تھی۔ اُن کے اور رشتہ دار بھی فوج میں تھے۔ اُنھوں نے چند روز تک والد کو گھوڑے کی سواری سیکھنے میں مدد دی تھی صرف اس احسان کو والد نے ہمیشہ یاد رکھا۔ اپنے ثروت کے زمانہ میں اپنے محسن کی بہت کچھ مالی مدد کی اور اُن کے انتقال کے بعد اُن کے بچّوں کی تعلیم کرائی اُن کو نوکر رکھایا اور دوسرے پسماندگان کی ہر طرح پر خبر گیری کی۔ والد ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو ہمیشہ محسن ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے اور حتی الامکان ممنون ہونے سے بچنا چاہیئے۔

کفایت شعاری و سادگی یہ پیشتر بیان ہو چکا ہی کہ والد مرحوم کی زندگی صحیح معنوں میں

اعتدال پر مبنی تھی۔ ان کا طرز عمل اور ان کے عادات ہر ایک قسم کے اسراف سے پاک تھے۔ ہر ایک حالت میں اُنھوں نے اپنی مذاق اور ضرورتوں کو حد کے اندر رکھا۔ جائز اور ضروری عیش اور آرام اُنھوں نے ہمیشہ کیا لیکن ضرورت سے زیادہ اُنھوں نے کبھی اپنے یا اپنے متعلقین پر صرف نہیں کیا۔ جب ان کی بیس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی اُس وقت اور جب بائیس سو روپیہ ماہوار تھی اُس وقت بھی آمدنی سے خرچ زیادہ کسی حالت میں نہیں کیا۔ اپنے اور اپنے متعلقین کے کھانے یا پینے یا اور ضروری آرام و آسایش میں کبھی تنگی یا کمی نہیں کی۔ ان کی طبیعت میں خست قطعی نہیں تھی لیکن محض نمایش یا غیر ضروری چیزوں پر اُنھوں نے کبھی خرچ نہیں کیا۔ زندگی بھر ان کا اصول یہ رہا کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کبھی نہیں کیا۔ جس قدر آمدنی ہوئی اُس میں سے اول اپنے اور اپنے متعلقین کے ضروری اخراجات کیئے۔ بچوں کی تعلیم پر پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ صرف کیا۔ غریب رشتہ داروں کی مدد کی اور ایک مقررہ حصہ خیرات کے لیئے رکھا۔ اور جو کچھ بچا اُس کو پس انداز کیا۔ یہ سچ ہی کہ جس قدر ان کی آمدنی بڑھتی گئی اُسی کے لحاظ سے ان کے اور ان کے متعلقین کے کھانے پینے اور رہنے کے معیار میں اضافہ ہوتا گیا لیکن چونکہ ہر ایک چیز ایک اندازہ کے اندر تھی اس لیئے جس اصول کے تحت میں اُنھوں نے ہمیشہ اپنی آمدنی کو صرف کیا اُس میں کبھی فرق نہیں آیا۔ صحیح معنوں میں کفایت شعاری اور سادہ زندگی کے اصول پر ان کا عمل رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر پوری دیانت اور ایمانداری کے ساتھ ملازمت کرنے کے باوجود پوری آسایش اور نوابی شان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ اپنے متعلقین کو پورے آرام اور خوش حالی سے رکھا۔ غریب رشتہ داروں کی بہت کچھ مدد کی۔ خیرات ساری عمر بڑے پیمانہ پر کی۔ بیٹوں کو شاہزادوں کے برابر اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم دلائی۔ وطن اور گوالیار میں بڑے بڑے پختہ مکانات تعمیر کرائے۔ لڑکوں اور لڑکی کی شادیاں کیں۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد انتقال کے وقت معقول رقم بنک میں اور کمپنیوں میں حصے چھوڑے۔ یہ وہ طرز زندگی ہی جو ہر طرح پر قابل تقلید ہی لیکن اُس پر عامل ہونے کے لیئے جس قدر حق و باطل میں تمیز کرنے کی

قوت درکار ہے اُسی قدر ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ اول اس امر میں صحیح جانچ کرنا کہ جائز آرام و آسائش کے لیئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور اُس کے بعد جو چیزیں ضروری ہوں اُنھیں پر قناعت کرنا اور استقلال کے ساتھ عمر بھر اُس کے مطابق عامل رہنا آسان نہیں ہے۔ والد مرحوم کو اعتدال کا نہایت صحیح اندازہ تھا اور اُس کے مطابق عمل کرنے کی اُن میں پوری قوت اور قابلیت تھی۔

اظہار عجز سے نفرت

والد مرحوم کے کیریکٹر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ضعف کا اظہار یا اعتراف گو کسی شکل میں بھی ہو اُن کو سخت ناگوار تھا۔ یہاں تک کہ مرض کی حالت میں بھی وہ کمزوری یا تکلیف کی شکایت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس لیئے طبی یا ڈاکٹری علاج سے حتی الامکان وہ احتراز کرتے تھے۔ چونکہ یونانی طب اُنھوں نے حکیم امام الدین خاں صاحب سے ٹونک میں پڑھی تھی اور بہت سے مجرب نسخے اُن کے پاس تھے۔ ضروری شکایات کے لیئے اُن کے پاس چند ادویات رہا کرتی تھیں لیکن حکیموں یا ڈاکٹروں کا علاج اُنھوں نے عمر بھر میں بہت ہی کم کرایا یہاں تک کہ گو انتقال سے پیشتر دس بارہ سال تک ذیابطیس کا مرض اُن کو رہا لیکن اُنھوں نے اُس کے علاج پر کبھی توجہ نہ کی۔ ہمارے سخت اصرار پر چند مرتبہ ڈاکٹروں کو قارورہ دکھلایا لیکن نہ کبھی دوا کی اور نہ پرہیز کیا اور اگر اُن سے علاج کے لیئے کہا جاتا تھا تو اُن کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اظہار یا اعتراف ضعف سے اُن کو سخت تکلیف ہوتی تھی اس لیئے حکیموں یا ڈاکٹروں سے اپنے عارضہ کو بیان کرنا اُن کو کسی طرح پسند نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ غلطی تھی کیونکہ انسان کے قویٰ کتنے ہی تندرست کیوں نہ ہوں تاہم بقائے صحت اور قوت کے لیئے علاج اور طبی مشورہ بعض حالتوں میں ضروری ہیں والد مرحوم چونکہ خود علم طب سے واقف تھے اس لیئے اس حقیقت کو سمجھتے تھے لیکن باوجود اس کے بھی اُن کو اس کی برداشت نہ تھی کہ وہ اظہار یا اعتراف ضعف پر مجبور ہوں۔

روزنامچہ لکھنے کی عادت اور اُس کا نمونہ

والد مرحوم ابتدائے عمر سے روزنامچہ فارسی میں لکھتے تھے جو انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ پیشتر تک جاری رہا۔ جب کبھی وہ روزنامچہ کی نئی جلد شروع کرتے تھے تو فارسی نظم سے اُس کا آغاز کرتے تھے۔ چنانچہ یکم محرم ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۸۹۰ء

کو جو جلد شروع ہوئی اُس کے اول میں حسب ذیل نظم لکھی ہی:۔

بیادِ خویش یارب صرف کن ہر سال و ماہم را
منوّر کن ز نورِ جلوہ ات روزِ سیاہم را
مرا بر آستانِ تست نازِ جبہ فرسائی
بکن ہمرنگ اکلیلِ سکندر کج کلاہم را
پگاہ شام چشمِ کامیابی از تو میدارم
تجلّی بخش مہرم را فروغ افروز ماہم را
سرت گردم چہ کم گردد اگر یک جلوہ بنمائی
برائے یک نفس یک سو نہی ایں فرق باہم را

اسی طرح جو جلد ۵ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۵ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو شروع ہوئی اُس کے ابتدا میں ذیل کی نظم لکھی ہی:۔

بیادِ خویش یارب صرف کن جوشِ کلامم را
بہ لوحِ مدح خوانانِ خودت بنویس نامم را
سرت گردم فدائے ذکرِ پاک تست جانِ من
نقاب از چہرہ بردار و ز من بشنو پیامم را
خرام از خلوت و در بزم جلوت جلوہ فرما شو
ز نورت صبح روشن کن شبِ تاریک شامم را
انیس مہربانم شو بہ ہر یک رنگ تسکیں دہ
معطر کن بہ بوئے عطرِ لطفِ خود مشامم را
مرا دریاب و انوارِ جمالت شمع راہم کن
پذیرا کن دعائے من روائی بخش کامم را

اسی طرح جو جلد یکم ربیع الاول ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۸۹۸ء کو شروع ہوئی اُس میں حسب ذیل نظم لکھی ہے:-

مرادریاب از لطف خوت پروردگارِ من
امید ابر رحمت میکند مشتِ غبارِ من
براه انتظارِ شاہد وصلِ تو وابینی
درِ من چشم من بندِ قبائے من کنارِ من
بده نیروی عالم گیر گرنا تجربہ کاری
حریف شہسواران است طفلِ نی سوارِ من
تنک آییم چنداں آبیاری ہا کرامت کن
کہ قلزم تشنہ لب آید بسوئے رود بارِ من
من وتا چند اوقاتِ گرامی رائیگاں دادن
بده نیروی کاروکار تا انجام کارِ من
ازیں تنہائی جاں کاہ خار اندر جگر تا کے
حضوری آرزو دارم ز نوای کردگارِ من
مریضم دردمندم عاجزم متروک دورانم
دوائے خود کجا جویم بگو اے غمگسارِ من
ز دست وزورِ من ای کاش رفعت یافتی پیہم
من و قومِ من و ملکم نواحِ من و یارِ من
دُعائے احمدی بپذیر تا دایم ز لطفِ تو
بہار آرد خزانِ من فزوں بالد بہارِ من

مذہبی عقیدہ والد مرحوم مذہبی عقائد میں پابند تقلید نہ تھے بلکہ بہت کچھ آزاد خیال تھے

[library stamp, partly cut off]

مگر توحید جو اسلام کی جڑ اور بنیاد ہی اُس میں وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر معاملہ میں اور ہر وقت ان کو خالق ذوالجلال کا خیال رہتا تھا۔ ان کے روزنامچے کے ہر ایک لفظ سے توحید کا رنگ عیاں ہے۔ نمونہ کے طور پر چند تاریخوں کے اندراجات نقل کیے جاتے ہیں۔ ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۹۱ء کو ہم دونوں بھائی بمبئی سے انگلستان کو تعلیم کے لیے روانہ ہوئے۔ والد مرحوم ہم کو بمبئی تک پہونچانے تشریف لے گئے۔ اُس تاریخ کے روزنامچہ میں حسب ذیل اندراج ہے:-

"۲۹ رمضان ۱۳۰۸ھ قریب نیمہ روز بامید فضل و رحم خداوند بندہ نواز چارہ ساز حافظ ذوالجلال و ناصر لایزال جل جلالہ برخورداران سلطان احمد خاں احمدی و آفتاب احمد خاں احمدی طال اللہ تعالے عمرہم و زاد اللہ تعالے اقبالہم آمین ثم آمین بعزم سفر لندن بغرض حصول تعلیم بیرسٹری بر جہاز سوار شدند من ہم بر جہاز تا آغا زیبومی پاس قیام کردم مسافران یورپین و اہل ہند بودند چوں یک و نیم ساعت نجومی بر نیمہ روز سپری شد ہر دو را بحفاظت و حمایت خداوند حقیقی سپرسپردہ بہ کشتی سوار شدہ و را پا لو ہوٹل رسیدم۔ خداوندا میدانی کہ ہیچ یک کار از ہیچ کسے بجز امداد خاص ذات والاے تو شدہ نمی تواند اگر مدد فرمائی حصول سلطنت و انتظام عالم کرشمہ سہل می باشد بفضل خویش فرزندانم را کہ فی الحقیقت و بے شک عطیہ تستند و بامید فضل تو روانہ انگلستان شدہ اند بحفظ و حمایت خود داری و کامیاب فرمودہ از لقای شان من نابکار و دوستان شان را سرور بخشی آمین ثم آمین"

یکم ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۹ جون ۱۸۹۱ء سہ شنبہ فضل و رحم توانا خداوند را نازم کہ شادم ہستم اول روز خربزہ ہائی ٹونک فرستادہ صاحبزادہ محمود خاں صاحب بہ معیت یک مولوی مصاحب شان رسیدہ مذاق زبان و دہان افزودند سپاس ایزد توانا جل جلالہ می گزارم کہ چنیں مقتدران از چنیں بعد مسافت بہ ارسال تحائف یاد میکنند۔ نیز امروز گوکل سہائے مودولی را ضروری خرچ دادہ رخصت کردم۔ وقت معین بفضلہ تعالیٰ بہ کچہری رسیدہ داد مستغیثین دادم

ہمہ روز طعام خوردم ایندم کہ پسین روز بعنایۃ تعالیٰ در صدر کمرہ خود نشستہ ام و باد ش
چرخی ملازمان می جنبانند ہوائے خوش می آید سپاس شفیق خداوند نتوان شمرد کہ من ہیچکارہ
ناپاک را چنیں انعام والطاف نواخت سپاس اوست سپاس اوست "

سب سے آخری اندراج یعنی جو انتقال سے گیارہ روز پیشتر کا ہے حسب ذیل ہے:-

"۴ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ فی الجملہ خفت در مرض است الحمد للہ۔ نامۂ آفتاب سلمہم اللہ تعالیٰ
مشعر صحت و عافیت شان رسید سپاس توانا خداوند عاجزان نوازی بجا آوردیم "

غرضیکہ توحید میں وہ مٹے ہوئے تھے جیسا کہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ ان کے
ذیل کے اشعار سے ان کی توحید کے رنگ کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے:-

ہجوم بندگاں ہے دھوم ہے معبود کے در پر
فدایان الٰہی آؤ بابِ ربِّ اکبر پر

ادب ای دیدۂ بینا یہ بابِ کبریائی ہے — فراق ای خود پسندی جوش شوق جبہ سائی ہے
لحاظ ای گوش شنوا موقعِ یزداں ستائی ہے — الگ رہ فکر دنیا ہم ہیں اور رحمت سرائی ہے

کہو تشویش دل سے اپنا بدھنا بوریا باندھے
حسد کمبل اُٹھائے اور تعصب بسترا باندھے

ہمیں لازم ہے سچے صانع برحق کے قائل ہوں — رضا جوئی میں اُس کی جان سے اور دل سے مائل ہوں
اُسی کی ناوکِ الفت میں دل سینوں میں گھائل ہوں — اُسی کے لطف پر نازاں اُسی کے در پہ سائل ہوں

اُسی کے بابِ عالی پر جائے بسترا رکھیں
اُسی کی آرزو رکھیں اُسی کا آسرا رکھیں

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں:-

گدایانِ درِ دولت کی یہ اونچی نگاہیں ہیں
لگائیں ٹھوکریں گر پیش پا ہو ٹھاٹھ شاہانہ

ایک اور نظم میں ارشاد ہے:-

کہو فلسفی سے کہ ذوفنون تری سن چکا میں چگونہ و چوں ۔۔۔ نہیں تجھ کو گر اثرِ جنوں تو یہ اتنی بحث بڑھائی کیوں

تو خود اپنی اصل بتا تو دے کہ تو عین روح ہے یا کہ خوں ۔۔۔ ہیں اگر حواس بجا ترے تو یہ بات مان جو میں کہوں

درِ کبریائے کریم پر اُٹھو مل کے سر کو جھکائیں ہم

بخشوع ذکرِ خدا کریں بخلوص حمد سنائیں ہم

مجھے چھوڑ کشمکشِ جہاں دبے ضرورتِ این و آں ۔۔۔ تمھیں ساتھ رکھوں کہاں کہاں مجھے مل چکا ہے وہ آستاں

صفِ انبیاء و ملائکہ ہو فورِ شوق و طرب جہاں ۔۔۔ پس و پیش ہیں جو ادب کھڑے مجھے دیکھ کر یہ کہا کہ ہاں

درِ کبریائے کریم پر اُٹھو مل کے سر کو جھکائیں ہم

بخشوع ذکرِ خدا کریں بخلوص حمد سنائیں ہم

میں پھرا ہوں ہر میں جا پہ سوئے صیدِ طائرِ آرزو ۔۔۔ نہیں چھوڑا جادۂ جستجو نہ رکا کہیں نہ تھما کبھو

نہ مٹی حرارتِ دل کہیں نہ جگر کا بند ہوا لہو ۔۔۔ مگر اب میں آپ طبیب ہوں جو ملا ہے بابِ شفا ہو

درِ کبریائے کریم پر اُٹھو مل کے سر کو جھکائیں ہم

بخشوع ذکرِ خدا کریں بخلوص حمد سنائیں ہم

صبحِ نور کی ایک اور نظم میں فرماتے ہیں:-

قسم اُس ذاتِ اقدس کی فدا ہے میری جاں جس پہ ۔۔۔ یہ سب کچھ ہے ایک ادنیٰ سا ظہورِ قدرتِ داور

اگر ہم سب کے سب افرادِ عالم ہوں ثنا گستر ۔۔۔ ازل سے تا ابد ہر موئے تن سے صد زباں ہو کر

بیاں ہو وصف اک شمہ نہ اُس سرکارِ عالی کا

کہاں تک دائرہ پھیلے گا میدانِ خیالی کا

جلیل بے نیاز پاک اور بندہ تیرا ہوں ۔۔۔ شکستہ دل قتیلِ یاس ہوں بالکل نکما ہوں

کیا کیا ہے جو کچھ مانگوں میں کس گنتی میں ہوں کیا ہوں ۔۔۔ فقیرِ بد سلیقہ ہوں گدائے بے سروپا ہوں

نگاہیں روبرو ہوتی نہیں فرطِ ندامت سے

مگر سنتا ہوں دعویٰ ترے لب ہائے رحمت سے

ایک اور نظم میں فرمایا ہے:-

الٰہی میں بھی ہوں گرم نظارہ تیرے گلشن میں ‏ ‏ ‏ بجز اشکِ ندامت کچھ نہیں ہے میرے دامن میں
اچنبھا ہے تہی دامن ہوں پھولوں کے خرمن میں ‏ ‏ ‏ شکایت ہو اندھیرے کی ظہورِ روزِ روشن میں

ترے محفوظ کو کوئی ضرر پہنچا نہیں سکتا
عناصر چھو نہیں سکتے فلک دھمکا نہیں سکتا

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے مرحوم کی توحید خاص تھی اس لیے کسی شکل میں بھی وہ شرک کو جائز نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ ان کے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:-

سوا تیرے کہیں ہم کو سہارا مل نہیں سکتا ‏ ‏ ‏ ہمیں کافی ہے تیرے در پہ رتبہ جبہ سائی کا
فنا کے رہروؤں سے بے حسوں سے عرضِ مطلب کیا ‏ ‏ ‏ تیرے جویا کو موقع جبکہ تجھ تک ہو رسائی کا
سوا تیرے جسے ڈھونڈا وہ گرمِ عزمِ رفتن تھا ‏ ‏ ‏ تمنائے وصالِ غیر میں تھا غم جدائی کا
جو خود مٹ جائے وہ کیا ہو کسی کے درد کا مرہم ‏ ‏ ‏ کرے محتاج کیونکر حوصلہ حاجت روائی کا

صبح نور کی ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں:-

ستم ہے اس کا در ہم چھوڑ کر بھٹکے پھریں در در ‏ ‏ ‏ سمندر کے عوض میں ہاتھ پھیلائیں حبابوں پر
نہ ڈھونڈیں باغباں کو گلبنوں کی دھن میں شوریدہ ‏ ‏ ‏ نہالِ سبزہ جو دیکھا لگا بیٹھے وہیں بستر

نہ سمجھے ہر نہال اک روز پامالِ خزاں ہوگا
قیامِ صحنِ گلشن تا رضائے باغباں ہوگا

صبح نور کی ایک اور نظم میں لکھا ہے:-

ہم اور ہماری نسل والے ‏ ‏ ‏ تو نے ہی کرم سے اپنے پالے
افتادوں کو خاک سے اٹھا لے ‏ ‏ ‏ او سینے کی بات سننے والے

تجھ بن نہیں ما سوا سے مطلب

ہم بندوں کو ہی خدا سے مطلب

ہم کیوں ہوں حزیں ملول کیوں ہوں — در در کے گدا فضول کیوں ہوں
صرف الم و خمول کیوں ہوں — جیتے ہوئے خاک دھول کیوں ہوں

افسردہ نہیں خدا ہمارا
تارک نہیں کبریا ہمارا

ایک اور نظم میں ارشاد ہی:-

در اغیار پر جھکنے نہ دے سر اپنے شیدا کا — نہیں دشوار کچھ تجھ کو روا کرنا تمنا کا
غرض کیا میکدوں سے خم کشانِ لب ارنی کو — ہماری آنکھ میں رتبہ نہیں کچھ جام و مینا کا

غرضیکہ سچی توحید میں جس قدر ان کو انہماک تھا اُسی قدر شرک کے وہ مخالف تھے۔

حصّہ دوم

علمی و ادبی خدمات

طبیعت کی موزونیت یا شاعری ایک خدا داد ملکہ ہی جو مبدء فیاض سے خاص خاص لوگوں کو عطا ہوتا ہی اور اُس کے آثار بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ موزوں طبع اشخاص اور شعراء کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھوں نے عالم جوانی یا کہولت میں شاعری کا آغاز نہیں کیا نہ فن شعر و شاعری کو کسی تعلیم گاہ میں کورس کے طور پر پڑھا بلکہ وہ بطن مادر ہی سے شاعر پیدا ہوئے یہی سبب ہی کہ دنیا کے مشہور و نامور شعرا اس کے مدعی ہیں کہ جو لطیف و نازک خیالات اُن کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے عالم سے آتے ہیں اور یہ سچ بھی ہی ایک شاعر اگر کبھی اپنے اُستاد سے کچھ سیکھتا ہی تو وہ زبان اور محاورات ہیں یا الفاظ کی

ترتیب خیالات و مضامین شاعری کے لحاظ سے وہ کسی کا منت کش نہیں ہوتا۔

بے شبہ علم اللسان کی تعلیم اور قواعد وعروض کی واقفیت، دائرہ معلومات میں وسعت پیدا کر دیتی ہے لیکن مضامین کی بلندی، خیالات کی ندرت، تشبیہ و استعارہ کی لطافت طبع موزوں اور ذوق سلیم ایسی چیزیں ہیں جو کبھی سکھی نہیں جاتیں بلکہ فطرت کا عطیہ ہیں، اس لیے بچپن ہی سے اُس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری ایک فطری ملکہ ہے جس کو کسب و تعلم سے کچھ تعلق نہیں ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بڑے بڑے علما و فضلا باوجود اپنے فضل و کمال کے ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے اور بعض تو موزوں پڑھ بھی نہیں سکتے، برخلاف اس کے بہت سے معمولی قابلیت کے اشخاص جو علوم سے محض بے گانہ ہیں شاعری میں درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں، اُن کی قوت مشاہدہ ایسی زبردست ہوتی ہے اور وہ ادائے مطالب پر ایسے قادر ہوتے ہیں کہ نہ صرف واقعات و مناظر قدرت بلکہ لطیف جذبات و احساسات کی تصویر بھی وہ نہایت خوبی سے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچ دیتے ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں میں یہ ملکہ ہوتا ہے کوئی نہ کسی شکل میں بچپن ہی سے اُس کا ظہور ہو جاتا ہے اور وہ بغیر کسی صلہ یا شہرت کی آرزو کے محض اپنے جذبات سے متاثر ہو کر نظم کو اپنے خیالات کا ترجمان بناتے ہیں۔

قصّہ کرشن

والد مرحوم بھی فطرتاً موزوں طبع تھے اور بچپن ہی سے شعر کہنے کا ذوق رکھتے تھے چنانچہ جیسا کہ اوپر کسی موقعہ پر بیان کیا جا چکا ہے جب والد کی عمر صرف نو دس سال کی تھی اور اپنے وطن کے ایک مکتب میں تعلیم پاتے تھے اُس زمانہ میں اپنے ایک ہندو ہم جماعت کی خواہش پر اُنھوں نے کرشن جی کی ولادت اور مابعد کے سوانح و حالات کو مثنوی کی صورت میں نظم کیا، عمر کے لحاظ سے یہ کارنامہ لائق تعجب ہے۔ پورا قصّہ دلچسپ انداز میں مربوط و مسلسل طریقہ سے

بیان کیا ہی، طرز بیان اس قدر واضح ہی کہ کہیں تعقید یا ابہام کا نام نہیں۔ نمونے کے طور پر
چند اشعار ذیل میں نقل کیئے جاتے ہیں ؎

ای شہنشاہ بے نظیر و وزیر ۔۔۔ دیکھ چشم کرم سے سوئے فقیر
تیرے در تک میں روتا آیا ہوں ۔۔۔ اشک خجلت شفیع لایا ہوں
بندۂ نفس دوں و مرتد ہوں ۔۔۔ نام کا میں غلام احمد ہوں
کرتے ہیں منفعل گناہ مجھے ۔۔۔ ظل رحمت میں دے پناہ مجھے

اس کے بعد سبب تصنیف کتاب حسب ذیل اشعار میں بیان کیا ہی ؎

احمدی اب وہ حال کر اظہار ۔۔۔ جس کے باعث لکھے یہ چند اشعار
ہی احبا میں ایک نادر لعل ۔۔۔ عاقل و زیرک و حمیدہ خصال
ایک دن جبکہ تھا وہ گرم سخن ۔۔۔ مجھ سے کہنے لگا کہ مشفق من
ہی کئی دن سے یہ خیال مجھے ۔۔۔ نظم کر دیجیے ایک حال مجھے
حال کچھ کچھ کرشن جی کا ہی ۔۔۔ کیجیے منظوم یہ تمنا ہی

اس کے بعد قصہ کی ابتدا ذیل کے اشعار سے کی ہی ؎

کر دلا سیر گلشن تقریر ۔۔۔ عندلیب قلم ہی گرم صفیر
ہی مخاطب جو دم بدم مجھ سے ۔۔۔ یعنی کہتا ہی یوں قلم مجھ سے
مجھ سے یوں میرے ہمزباں نے کہا ۔۔۔ شہر متھرا میں ایک راجا تھا

یہ چند اشعار صرف اس غرض سے اس موقعہ پر نقل کیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہو کہ اس قدر
چھوٹی عمر سے والد مرحوم کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور ایسی تھوڑی عمر میں بھی اُن کو الفاظ و زبان
پر اس قدر قدرت تھی۔

مثنوی ہفت روز

مارچ ۱۸۷۵ء میں دہلی میں وائسرائے کا دربار ہوا جس میں والد مرحوم بھی شریک تھے۔ اُس وقت وائسرائے ہند نے تشریف آوری ہزرائل ہائی نس پرنس آف ویلز (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم کے لقب سے تخت نشین ہوئے) کا اعلان فرمایا۔ اس خبر کے معلوم ہونے پر والد مرحوم کو خیال آیا کہ شاہزادہ ممدوح کو تحفتاً دینے کے لئے وہ ایک ایسی کتاب تصنیف کریں جن میں سلاطین نامدار کے عادات اور حالات اور اُن کے نتایج کا ذکر ہو جس سے والیانِ ملک کو پند و نصیحت ہو۔ اس غرض کے لئے اُنھوں نے ایک نظم موسوم بہ مثنوی ہفت روز لکھی جسمیں سات تاریخی واقعات کا ذکر کر کے اُن کے لازمی نتایج کو سبق آموز پیرایہ میں بیان کیا۔ سبب تالیف کتاب کو اُنھوں نے ذیل کے اشعار میں ظاہر کیا ہے ؎

خوشی سے میں اب با دلِ شادماں — عجب ایک کرتا ہوں دلکش بیاں

کہ کل شب شبِ ماہ میں با فراغ — گیا سیر کرنے کو میں سوئے باغ

میرے ساتھ جلسہ تھا احباب کا — کوئی خوش بیاں کوئی شیریں ادا

کہا میں نے یارو براہ کرم — سنو سب کہ ایک بات کہتے ہیں ہم

شہنشاہ زادہ بہ آہنگِ سیر — سوئے ہند آتا ہے با دشِ بخیر

سکندر منش مہ لقا خوش خرام — فلک جاہ شہزادۂ ویلز نام

مرے دل میں ہے میں لکھوں ایک کتاب — مگر وہ کہ ہو بے عدیل و جواب

کروں پیش خدمت میں شہزادہ کی — بعجز و ادب با نیاز و خوشی

وہ منظور ہو مجھ کو لکھنی کتاب — کہیں وہ جس سے ہوں فیض یاب

شہوں کو طریقِ عدالت دکھائے | غریبوں کو آرام و راحت دکھائے
مضامین ایسے لکھوں اُس میں چست | کہ ہوں جن سے اخلاقِ شاہاں درست
اگر نظمِ ملکی کو مجمل لکھوں | طریقِ تمدن مفصل لکھوں
ستم کی خرابی کو کرکے بیاں | جتاؤں میں انصاف کی خوبیاں
جو ہیں کام شاہوں کے حق میں نہ یوں | میں اُن کو مفصل شرح لکھوں
لکھوں پہلے میں ایک حکیمانہ پند | مثالی کہوں قصہ پھر سودمند
مثالی وہ قصے لکھوں معتبر | کہ تاریخ دیتی ہو جن کی خبر
کہا سب نے یہ ہو تو کہنا ہی کیا | نہیں اس سے بہتر کوئی مدعا
اسی طرح اب کرکے میں التزام | کروں سات دن میں یہ قصے تمام
رکھوں نام ناصح کا فرزانہ میں | کہیں لکھ چکوں اب یہ افسانہ میں
ہو فیروز نام نصیحت پذیر | یہی التزام اب رہے تا اخیر

آغازِ داستان

سُن اے میرے ہمدم بصدق و صفا | کوئی شہر اک دانش آباد تھا
حکیم اُس میں رہتا تھا فرزانہ نام | فراست میں مشہور ہر خاص و عام
کوئی شاہزادہ تھا فیروز نام | سپہرِ حکومت کا ماہِ تمام
دلیر و توانا و عالی ہمم | صفِ جنگ میں شیر مجلس میں جم
وہ آغازِ طفلی سے تھا ہونہار | اُسے ہمت و عقل کرتی تھی پیار
وہ کھاتا تھا اس فکر میں پیچ و تاب | کہ ہو جاتے ہیں خانداں کیوں خراب
زوالِ شہی کے ہیں اسباب کیا | یہ بننا بگڑنا ہے کیا ماجرا
کوئی دم میں ہوتا ہے اقبال مند | کسی کو پہونچتا ہے دم میں گزند
بنا گاہ کچکول سے تاجِ زر | کبھی تاجِ شاہی بکا دربدر

کبھی مس پہ چڑھتی ہے سونے کی جھول کبھی لعل بکتا ہے کوڑی کے مول
مشیروں نے غمگین جو پایا اُسے نہایت ادب سے جتایا اُسے
کہ گر تو چلے دانش آباد میں تو دل کے ترے سارے عقدے کھلیں
نصیحت کرے تجھ کو فرزانہ گر تو ہر حال ہو تیرے پیش نظر
یہ سُن شاہزادہ ہوا باغ باغ اُسی دم روانہ ہوا با فراغ
اُٹھا کر مسافت کے جور و جفا وہ فرزانہ کے پاس حاضر ہوا
ادب سے کیا اُس کو جھک کر سلام وہ شفقت سے بولا علیک السلام
لگا کہنے فرزانہ ای نیک بخت سزاوار تاج و سزاوار تخت
یہ اول نصیحت ہے ای مہرباں کہ غافل اُٹھاتا ہے بیشک زیاں
کمیں بیں سمجھ دشمنوں کو سدا تو رہ مستعد اور جنگ آزما
ہر ایک نکتہ میں عقل سے لے مدد نہ کر کام کوئی خلافِ
لڑائی کے سامان رکھ سب درست سپاہی وہ رکھ جو ہو چالاک و چست
ملازم پیادہ رکھے یا سوار ہو بے عیب صاحب نسب شان دار
کمینہ نہ ہو اور نہ ہووے ذلیل سواروں کے گھوڑے ہوں اونچے اصیل
ضمانت سے نوکر وہ سب رکھے جائیں کہ تا روز میداں نہ پیچھا دکھائیں
اٹھارہ سے ہوں تیس تک سب کے سن شروعِ جوانی اُمنگوں کے دن
جو منظور ہوں رکھنے نوکر ہزار تو اُن میں سے کر پانسو اختیار
مگر اُن کو تنخواہ معقول دے تو پھر اُن سے جو کام چاہے سو لے
شب و روز جنگی قواعد سکھا نہ دے پہرا چوکی سے فرصت سوا
یہ رکھ کلیہ یاد ہرگز نہ بھول کہ ہے مشق سب شی کی اصلِ اصول
ہو غافل اگر فوج سے بادشاہ ہو پیش نظر اُس کے روز سیاہ

تغافل کرے گر تو اے بے خبر | تو مثل ہمایوں پھرے در بدر
کہا شاہزادہ نے مخدوم کیا | آصف سے فرزانہ نے یوں کہا
عجب سرگذشت ایک سناتا ہوں میں | جو سوتے ہیں ان کو جگاتا ہوں میں
ہمایوں شہ ہند والا تبار | پس مرگ بابر ہوا شہریار

تخت نشینی کے بعد محمود شاہ اور بہادر خاں کے ساتھ ہمایوں کی جو لڑائیاں ہوئیں اور اول مرتبہ شیر شاہ کے مقابلہ میں وہ ظفر یاب ہوا اُس کے بعد بنگالہ پہونچکر جس عیش و آرام میں وہ پڑا اُس کی نسبت اس طرح پر حالات بیان کیے گئے ہیں ؎

عدوے جو شہ کو فراغت ہوئی | طبیعت بھی جویاے راحت ہوئی
پسند آئی اُس جا کی آب و ہوا | کچھ ایسا وہاں شاہ کا دل لگا
کہ ایک دن دیا شاہ نے حکم عام | میں کرتا ہوں ایک سال بھر یاں قیام
کرے عرض کوئی نہ ناخوش خبر | ارادہ ہے عشرت کا آٹھوں پہر
ہوا شاہ سرمست صہبا سے محو | وہاں پر کہ جس جا نہ بھی جائے لہو
حسینوں سے مطلب وجیہوں سے کام | مغنی سے ڈھب ساقیوں سے کلام
یہ شہرت ہوئی ہند میں جا بجا | کہ بزم ہمایوں ہے عشرت سرا
بڑھے فتنہ پردازوں کے حوصلے | شریروں کو پیدا ہوئے ولولے

اس حالت میں ہندال مرزا نے بغاوت کی اُس کے بعد شیر شاہ نے ہمایوں کو غافل پاکر دوبارہ حملہ کیا دوبارہ ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ کے وقت شیر شاہ اپنی فوج کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

شجاعانِ لشکر سے بولا کہ ہاں | سوئے لشکر شہ اُٹھاؤ عناں
کرو تم وہ کوشش دم کارزار | کہ باقی جہاں میں رہے یادگار
مقابل میں آوے اگر شیر نر | تو روباہ سے اُس کو سمجھو بتر
یہ کہہ کر وہ ٹوٹا شہی فوج پر | کمیں سے اُچکتا ہے جوں شیر نر

شہی فوج کا طرفہ احوال تھا
کہ ادبار اُن سب کے دنبال تھا

سواروں میں ہمت نہ گھوڑوں میں دم
پیادوں میں جرأت نہ تیغوں میں خم

سوار آنکھیں ملتے اُٹھے خواب سے
پیادے لگے پھرنے بیتاب سے

کوئی تیر ترکش میں ڈھونڈا کیا
کوئی میان سے تیغ کھینچا کیا

چڑھانے لگا کوئی دم پر لگام
غرض بدحواسانہ سب اہتمام

اُدھر فوجِ بدخواہ آتش فشاں
ادھر اپنی غفلت سے آفت میں جاں

اُدھر پے بہ پے یورشیں سخت سخت
ادھر شکوۂ دہر و افسوسِ بخت

دلوں میں اُدھر جوشِ فتح وظفر
ادھر بدحواسی سے مرنے کا ڈر

اُدھر نعرہ ہائے خوشی ہر نفس
ادھر گنگ نقارہ ساکت جرس

سپاہ شہی سے نہ کچھ بن پڑا
ہوا نذر تیغ دو دم جو لڑا

مظفر ہوا شیر خاں نامور
ہمایوں پریشان و خستہ جگر

ہوا داخلِ آبِ گنگ اس طرح
کوئی صید زخمی چلے جس طرح

گرا اپنے گھوڑے سے وہ نامدار
جلو میں پیادہ نہ کوئی سوار

کبھی لطمۂ موج سے غرقِ آب
کبھی سطحِ بحر پر جوں حباب

قریب اُس کے پہونچا کوئی آبکش
غرض کھینچ لایا وہ مردانہ وش

جو نام اُس نے پوچھا بتایا نظام
ہمایوں یہ سُن کر ہوا شاد کام

کہا پھر کہ اے خضر فرخ نہاد
تو اظہار کر اپنے دل کی مراد

کہا اس نے اے شاہ عالی نسب
تو دار الخلافہ میں جب جائے تب

کرے دو پہر تک مجھے بادشاہ
مرے سر پہ پہنائے زریں کلاہ

میرا سکہ جاری ہو خطبہ میرا
پڑھا جائے دل کا ہو یہ مدعا

میرے سر پہ رکھا ہو تاج ہمی
میں کروں غرض نیم روزہ شہی

کیا اس نے سب اس کا کہنا قبول | چلا پھر وہاں سے حزین و ملول
ہوا داخلِ آگرہ جب کہ شاہ | پریشان و بد دل حزین و تباہ
وہ حاضر ہوا جس سے اقرار تھا | وفا شاہ نے عہد اپنا کیا
کیا اس کو فرماں دہ نیم روز | ہوا تخت پر جب وہ رونق فروز
نکالے دلی اپنے ارمان سب | میسر ہوئی خسروانہ طرب
منگا مشک دینار و درہم کٹا | دیا اُس نے چمڑے کا سکہ چلا
یہ قصہ ہے مشہورِ عالم ہنوز | کہ سقہ ہوا تھا شہِ نیم روز
عدو سے ہمایوں دوبارہ لڑا | مگر پھر بھی اُس سے نہ کچھ بن پڑا
پریشانیاں اُس کی بڑھتی گئیں | تغافل کا انجام اچھا نہیں!
نہ پیتا تغافل کی گر وہ شراب | تو ہوتا بھلا اس طرح کیوں خراب

بند دیگر

اس بند میں قطب الدین بادشاہ کی مثال سے عیش عشرت اور کمینہ پروری کے مہلک نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ہوا دوسرا دن تو حاضر ہوا | وہ فیروز فرزانہ کے پاس آ
ہوا پھر جو فرزانہ گرم سخن | کہا شاہزادہ سے اے جانِ من
میری دوسری پند پر کر عمل | نہ آئے ترے کام میں تا خلل
جو ہو جس کے لائق وہ دے اُس سے کام | کہ ہیں خاص خاص اور ہیں عام عام
سفیہوں کو صحبت نہ کر تو پسند | کہ ہیں صحبتیں اُن کی ناسود مند
سبک سر کو ہرگز نہ کر راز دار | میری بات ہے قابلِ اعتبار
کہ کم ظرف ہوتے نہیں با وفا | پہونچتی ہے محسن کو ان سے دغا
قدم جو چھوئے اُس کو مت سر چڑھا | نہ لے کام پاپوش سے تاج کا

جو اس قول پر چاہتا ہو مثال — تو کرتا ہوں تجھ سے بیاں ایک حال

ملا قطب دیں کو جو تخت سہی — لگا ہند کی کرنے فرماں دہی

کوئی اور عادت نہ بھائی اُسے — بدل عشق بازی خوش آئی اُسے

ہوا مے کشی کا یہ دن رات شوق — یہی ذکر لب پر یہی دل میں ذوق

حسن نام ایک اُس کا خدمت گزار — پری چہرہ جادو لقا گلعذار

ہمیشہ جو خدمت میں حاضر رہا — دل شاہ اُس طفل پر آگیا

وہ نوخیز دل میں بسا اس قدر — کہ پھر شاہ کو کچھ نہ آیا نظر

اُسی پر توجہ اُسی سے کلام — اُسی پر کرم کی نظر صبح و شام

وہی ہم نشیں اور وہی ہو مشیر — کیا اپنی پیشی میں اُس کو وزیر

جب اُس کو وزارت کا منصب ملا — شگوفہ نیا سلطنت میں کھلا

پڑا اس تمنا میں وہ نابکار — کہ برباد ہو خانۂ شہریار

دیا مشورہ اُس نے سلطاں کو یوں — کہ کر بھائیوں کو ذلیل اور زبوں

حقیقی تھا ایک بھائی علائی دو — ہوئے قتل پیش شہ کینہ جو

پسند آئیں خود رائیاں شاہ کو — جو کچھ دل میں گزرا کیا ہو سو ہو

رہا ننگ کا بھی نہ کچھ شہ کو پاس — پسند آیا اُس کو زنانہ لباس

بنے کون پھر سلطنت کا دھنی — لباس شہاں جبکہ ہو اوڑھنی

اُسے شوق کرتی کا انگیا کا دھیان — کھلا سامنے ہر نفس پاندان

گلوری بنانے میں ایسا کمال — فرشتوں کے ہونٹوں سے ٹپکائے لال

ورے دیکھیے بزم میں یا پرے — زنانے کہیں اور کہیں مسخرے

شریفوں کو بلوا کے کرتا ذلیل — اڑاتے تھے باتوں میں اُن کو رذیل

حسن کو خسرو خاں کا بخشا خطاب — کیا اُس کو ہر طرح سے کامیاب

ترقی کا جویا تھا وہ ناشکیب
کیا ایک دن کیا اُس نے تازہ فریب

کہا شاہ سے ای شہ نامور
میں خدمت میں حاضر ہوں آٹھوں پہر

عزیز و اقارب ہیں سب بے قرار
تمنا ہیں ملنے کے پروانہ وار

وطن سے میرے بھائی بلائے ہیں
وہ ہیں آرزومند. مجھ سے ملیں

خداوندا یہ مجھ کو فرصت کہاں
کہ میں ملنے خود اُن سے جاؤں ہاں

یہاں آئیں وہ یہ اجازت نہیں
میں واں جاؤں یہ مجھ کو فرصت نہیں

ملاقات خویشوں سے ہو کس طرح
کروں میں وہی حکم ہو جس طرح

کہا شاہ نے اُس سے ای میری جاں
کوئی معتبر تجھ سے بہتر کہاں

ترے بھائی بھی کیوں نہ ہوں معتبر
تو اب اُن سے ملنے کا کچھ غم نہ کر

دیر کاخ کی کنجیاں سب تو لے
جو ہو معتبر تیرا تو اُس کو دے

عزیزوں کو تیرے اجازت ہی عام
کہ جب چاہیں آیا کریں صبح و شام

ہر ایک شخص پر کھل گیا راز پھر
کہ یہ اپنے موقعہ کے ہیں منتظر

مگر کس کی طاقت کہے شاہ سے
کہ تو اب کوئی دن کا مہمان ہے

پسِ چند روز ایک شب یہ ہوا
حسن کے ہوئے جمع سب اقربا

کیا پاسبانوں کو قتل و تباہ
بڑھے سب کے سب جانب بامِ شاہ

کہا شاہ نے چونک کر کیا ہے یہہ
یہ کیا غل ہے کس طرح غوغا ہے یہہ

حسن نے دیا دست بستہ جواب
کہ ای رشکِ جم شاہِ والا جناب

طویلے کے گھوڑے سکے ہیں یہ کھل
مچاتے ہیں لڑ لڑکے آپس میں غل

یہ تھا لفظ اُس کی زباں پر ہنوز
کہ چڑھ آئے وہ سب کے سب تیرہ روز

انھیں دیکھ کر شاہ گھبرا گیا
اُٹھا بدحواس اور وہاں سے چلا

حسن نے پکڑ شہ کے پیچھے سے بال
جھٹک کر زمیں پر دیا اُس کو ڈال

حسن کے برادر نے بد لفظ بول
دیا پیٹ میں شہ کے خنجر گھنگول

کیا شہ کے لاشے سے سر کو جدا
دیا بام سے پھینک با صد جفا

گیا اندرونِ حرم بے دریغ
کیا شہ کی اولاد کو زیر تیغ

کیا شہ کی زوجہ سے اپنا نکاح
ستم کو کیا اپنے حق میں مباح

خرد خاں ہوا مالک تخت و تاج
زمانہ کے کیا طرفہ ہیں کام کاج

نہ ہوتا اگر شہ کمینہ پسند
تو کاہے کو اُس کو پہونچتا گزند

پند سوم

اس پند میں نپولین اعظم کی مثال سے تکبر اور فرعونیت کا جو انجام ہوتا ہے
اُس کی طرف توجہ دلائی ہے

ہوئی جب سحر تیسرے روز کی
وہی شاہزادہ کو تھی لو لگی

کہا شاہزادہ نے ای رہ نما
میں حضرت کے ارشاد دو سُن چکا

عنایت سے کچھ اور فرمائیے
کوئی دم نصیحت کیئے جائیے

حکیم سخن فہم گویا ہوا
کہ ای شاہ صالح ادھر سن ذرا

نہ بے سوچے کر بیٹھ ہر کار سخت
مبادا موافق نہ ہو تجھ سے بخت

نہ بے سوچے کر نوش جام غرور
نہ خود اپنے نزدیک بن بیٹھ دور

قوی بازوؤں کو سمجھ مت ضعیف
سلیماں کو مت جان مور نحیف

زیادہ جو ہو تیری قدرت سے کار
تو نزدیک اُس کے نہ جا زینہار

تکبر بھلا دے جو فکر مآل
تو تیرا نپولین کا سا ہو حال

ہوا جب نپولین شاہِ فرانس
تو بھرتا تھا ہر یورپ ٹھنڈی سانس

مگر بخت نے اُس کے کی یاوری
وہ شاہوں پر کرنے لگا سروری

ظفر اُس کے ہمراہ پا در رکاب | جدھر اُس کا رُخ اُس طرف فتحیاب

فنِ حرب میں تھا وہ یکتائے دہر | زمیں پر وہ بگڑے تو کانپے سپہر

وہ حاصل کیا جنگِ ٹونس میں نام | تہہِ خاک سُن کر لرز جائے سام

کیا گاہ اٹلی کو پامال و زیر | کبھی مصر پر چڑھ گیا وہ دلیر

کبھی شام پر اُس نے دھاوا کیا | کبھی فتح ملکِ پُرشیا کیا

گرے اُس کے خنجر سے جسم و غلاف | جگر کس کا پھرے جو نام مصاف

جدھر اُس کا وہ توپ خانہ چلے | عدم کی طرف اک زمانہ چلے

وہ آغاز میں گو تھا مردِ غریب | ولیکن ہوا اُس کا یاور نصیب

پیاپے جو حاصل ہوا عزّ و جاہ | ہوئی روز روز اُس کی اونچی نگاہ

ہوئی اُس کو حاصل جو ہر جا ظفر | نگاہوں سے اُس کی گرا ہر بشر

تکبّر نے اُس کو دلایا یقیں | کہ اب دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

اگرچہ وہ خوش فکر فرزانہ تھا | مگر اُس کو نخوت نے دھوکا دیا

وہ جب جس سے بگڑا لڑا بے دریغ | کیا ملک کے ملک کو زیرِ تیغ

ہوا سہل بننا بگڑنا اُسے | ہوا روز کا کھیل لڑنا اُسے

نہ سمجھا کہ اچھا نہیں جنگ روز | کبھی ساز ہوتا ہے خوش گاہ سوز

شہِ روس سے گرچہ تھا اتفاق | مگر سہل ہی پیش آیا نفاق

نہ تھے کچھ امور ایسے اُلفت گسل | رہے جس سے ناخوش ہمیشہ کو دل

نپولین لیکن بھبوکا ہوا | نہ کچھ ذکرِ شکر و شکایت کیا

برافروختہ ہو کے کہنے لگا | کہ دونگا شہِ روس کو میں سزا

شہِ روس سے چھین کر تاج و زر | کروں کشورِ روس زیر و زبر

مٹاؤں میں سکّہ سے اُس کا لقب | مخالف ہوا مجھ سے وہ بے ادب

کروں اس کے سر سے تکبّر کو دور | جھکاؤں بزور اس کا فرقِ غرور
میں لوں میان سے خنجرِ خوں فشاں | کروں اُس سے میں خوں کے دریا رواں
بھلا دوں انھیں باندھنا تیر و تیغ | کروں قتل پیر و جواں بے دریغ
وزیروں نے جب یہ ارادہ سُنا | رہے محوِ حیرت کہ یارب یہ کیا
بہت عرض کی ای شہِ نامور | کرو اس مہم کو ذرا سوچ کر
نہیں اس میں تعجیل کرنا روا | خدا جانے کس کو ملے مدعا
گرہ ہو سکے ناخنوں سے جدا | اُسے دانت سے کون ہی کھولتا
ہوئے سب کے سب عجز سے ملتجی | نپولین نے کچھ توجہ نہ کی
ہوئی جمع چھ لاکھ جنگی سپاہ | چلے تو فلک تک اُڑے گرد راہ
جدھر دیکھیے فوج کے جھمگھٹے | نظر آئیں توپوں سے میدان پٹے
چڑھا روس پر شاہ از بہرِ جنگ | نیا حوصلہ اور انوکھی اُمنگ
اُدھر سے شہِ روس با کرّ و فر | مقابل ہوا راہ میں آن کر
نپولین پیاپے ہوا فتحمند | ہوا دم بدم روسیوں کو گزند
ہوا روسیوں کو بدل یہ یقیں | کہ اس جنگ میں فتح ممکن نہیں
مگر بھاگنا بھی ہی مردوں کو عار | گوارا کرے کون ننگِ فرار
ہٹے پیچھے میداں سے لڑتے ہوئے | قدم آگے گہہ پیچھے پڑتے ہوئے
لڑے جم کے گاہے کبھی ہٹ گئے | کبھی چل دیئے اور کبھی ڈٹ گئے
کبھی آنکھیں پھیریں دکھائیں کبھی | چرائیں کبھی اور لڑائیں کبھی
نپولین تعاقب کیے گرمِ جنگ | اُڑا تا شجاعوں کے چہروں سے رنگ
اجل کی طرح اُن کے پیچھے پڑا | ادھر لپ پڑا یاں گرا واں لڑا
شہِ روس نے طرفہ تدبیر کی | جو حق میں نپولین کے سم ہوئی

سر راہ جو ملک آباد تھا
اُسے روس والوں نے ویران کیا

نہ پائیں رسد تاکہ اہل فرانس
بھریں کشور سرد میں ٹھنڈی سانس

نہ گھوڑوں کو گھاس اور نہ دانا ملے
نہ کچھ اہل لشکر کو کھانا ملے

نہ غلہ میسر کہ دانے بھنائیں
نہ لکڑی میسر کہ شب کو جلائیں

نپولین نے پیچھا نہ چھوڑا مگر
کئی منزلوں تک گیا بے خطر

یہ سمجھا کہ دارالخلافہ جب آئے
مری فوج جب فتح اُس جا بھی پائے

تلافی وہاں یاں کی ہوجائے گی
رسد اُس جگہ خوب مل جائے گی

غرض جب گیا ماسکو کے قریب
وہی ساتھ اُس کے وہاں بھی نصیب

تو دیکھا کہ وہ شہر ویران ہے
وہاں آدمی ہے نہ حیوان ہے

دکانیں جدھر دیکھیے بند واں
نہ غمگیں کوئی واں نہ خورسند واں

تعجب سے حیرت کے دریا میں ڈوب
نپولین کہنے لگا واہ خوب

لگا دل سے کہنے کہ اب کیا کروں
نہ کوئی مقابل کہ اُس سے لڑوں

کروں کس سے صلح اور کس سے ستیز
نہ اب جائے ماندن نہ پائے گریز

نہ چھوٹا تھا اس فکر سے وہ ہنوز
کہ پیش آیا ایک صدمۂ روح سوز

عدو نے لگا کر ہر ایک سو سے آگ
جتائی اُسے اپنی پوشیدہ لاگ

جدھر آنکھ اُٹھاتا ہے یہ فتح مند
ہزاروں ہیں آتش کے شعلے بلند

نپولین القصہ گھبرا گیا
بہت فکر کی پر کچھ نہ ہو سکا

سراسیمہ وہ پا برہنہ وہ چلا
کہے تو کہ سرمست بادہ چلا

کبھی لڑکھڑایا گرا گاہ وہ
کبھی جلدی دوڑا پھرا گاہ وہ

چھتوں پر سے تانبا پگھلتا ہوا
سروں پر پیاپے برسنے لگا

ہزاروں مصیبت سے وہ راہ چل
در شہر سے باہر آیا نکل

بہت اُس کے ہمراہی خستہ خراب
ہوئے آتشِ غم سے جل کر کباب

جلا سازِ سیمیں و سامان زر
سوار و پیادہ دو آب و بشر

کیا بخت نے ہر طرح سے تباہ
ہوا جل کے اسباب خاک و سیاہ

نہ غلہ ملے گر تو کیا کوئی کھائے
زر و سیم کھائے کہ موتی چبائے

ہوا سخت ناچار شاہِ فرانس
یقیں ہو گیا زیست ہے کوئی سانس

دیا روس کے شہ کو پیغامِ صلح
اس آغاز کا تا ہو انجامِ صلح

مگر کچھ نہ پایا وہاں سے جواب
بہت کھا کے اس رنج میں پیچ و تاب

پھر اُس کو وہاں سے پلٹنا پڑا
بصد درد و افسوس ہٹنا پڑا

اگرچہ یہ سمجھا وہ عالی دماغ
کہ اب لگ چکا نیک نامی کو داغ

مرے نام سے کانپتا تھا جہاں
مٹایا یہاں آ کے نام و نشاں

کہے گا ہر اک یورپی بار بار
کہ لو وہ ہوا رہ نوردِ فرار

جو گزرا یہاں کوئی جانے یہ کیا
کہیں گے نپولین پس پا ہوا

ملی خاک میں نیک نامی مری
خدا جانے کیونکر رہے سروری

مری باگ تقدیر نے موڑ دی
میری تیغ اب چرخ نے توڑ دی

مجھے انگلشی ہوں گے پہنائے زن
پہن لوں بجائے قبا میں کفن

کروں چاک سینہ کو غیرت سے میں
کہیں مر رہوں اس ندامت سے میں

سمجھتا تھا سب کچھ وہ بیدار جاں
مگر بے رسد کیسے ٹھہرے یہاں

وہ آغازِ فصلِ زمستاں غضب
وہ بردِ فراواں مصیبت کے ڈھب

دلِ اہلِ لشکر گیا غم سے چھوٹ
قیامت کے صدمے پڑے اُن پہ ٹوٹ

نہ کھانے کو جز رنج و غم اُن کے پاس
پئیں وہ کہ آنسو لگے جب کہ پیاس

ادھر اُس پہ وہ فصلِ زمستاں کے زور
جدھر دیکھیے برف باری کے شور

عدو کی اُدھر مردم آزاریاں — ادھر موت کی گرم بازاریاں
لگی گھٹنے چشم زدن میں یہ فوج — لگی محو ہونے سمندر کی موج
نپولین نے گو یہ صدمے اُٹھائے — مگر ذکر کیا مَیل تیور پہ آئے
خبر اُس کو پیرس سے کچھ آ گئی — کہ جاں جسم میں اُس کے گھبرا گئی
جریدہ روانہ ہوا بے درنگ — وہیں چھوڑ کر فوج و لشکر کو تنگ
اُٹھا راہ کی وہ تکان اور تعب — جو پیرس میں پہونچا تو تھا وقتِ شب
پس از چند روز آکے پہونچی سپاہ — پریشاں مصیبت زدہ اور تباہ
ہوئے تھے رواں یہاں سے چھ لاکھ کس — پھرے لُٹ کے پنجاہ ہزار اور بس
نپولین کو اب یہ سوجھا کہ ہاں — نہیں ایک سا کاروبارِ جہاں
یہ چاہا کہ پھر دست و پا کچھ ہلائے — سنبھل جائے اور دشمنوں کو جلائے
مگر بخت و دولت نہ ہو جب کہ یار — نکلتا ہے کب عقل و ہمت سے کار
شہِ روس نے یہ دیا اشتہار — شہانِ یورپ کو پئے کارزار
کہ ہر شاہ مجھ سے کرے اتفاق — نپولین کو دے سزائے نفاق
پرشیا و اسٹریا مل روس سے — بہم متفق جنگ پر ہو گئے
مرد اہلِ انگلش نے بھی زر سے کی — نپولین پر سب بلا آپڑی
مقابل ہوا اپنے اعدا سے وہ — نہ باز آیا پیکار سے کھینچا سے وہ
ولیکن ہوا اُس کو پیہم ضرر — لگی ہونے اعدا کی فتح و ظفر
ملی اُس کو نخوت کی یاں تک سزا — کہ خود شہر پیرس مسخر ہوا
نپولین نے دیکھا جو یہ ماجرا — تحیر سے سر اُس کا پھرنے لگا
چلا ساتھ لے چند شخصوں کی صف — وہ فونٹین ولا کے محل کی طرف
وہاں جا کے دشمن کو تحریر کی — کہ ٹلتی نہیں بات تقدیر کی

۱۸۱۵ء

مگر خیر اب جو ہوا سو ہوا | میرا اب یہ ہی آخری مدعا
کہ میں تخت سے دست بردار ہوں | ولی عہد کو تاج اور ملک دوں
نیابت میں ہو اُس کی ملکہ میری | رہے گھر کی گھر میں بنی سروری
مجھے کچھ نہ ہو سلطنت سے غرض | جہان و متاعِ جہاں ہی مرض
بکھیڑوں سے دنیا کے آزاد ہوں | کروں ترک سامانِ غم شاد ہوں
یہ لکھنا نہ اُس کا پذیرا ہوا | فریبِ دروں صاف سمجھا گیا

جواب

وہاں سے ملا صاف پاسخ اُسے | کہ اس شرط سے صلح منظور ہی
کرے ترک شاہی تو بہرہ وام | پسر کو بھی تیرے نہ ہو اُس سے کام
نہ ملکہ کو تیری نیابت ملے | جسے ہم کہیں ملک و دولت ملے
پذیرا کیا اُس نے انجام کار | کرے کیا جو آجائے قسمت کی ہار
یہ تجویز شاہوں نے آپس میں کی | نپولین کے واسطے سب جی
کہ بیکار رہنا ہی اُس کا بُرا | کرو اُس کو فرماندہِ ایلبا
یہ چھوٹا جزیرہ ہی کافی اُسے | ملے گا وہاں قوت وافی اُسے
نپولین نے مجبور و لاچار ہو | ارادہ وہاں کا کیا ہو سو ہو
گریباں کیا ہجر پیرس میں چاک | اُڑائی کئی بار چٹکی سے خاک
ہوئی جمع فوج اور بدرد وبکا | ہوئی اُس کی آخر سلامی ادا
ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں | لگا کرنے سب بے ساختہ وہ فغاں
منگا کر نشاں اُس کو بوسہ دیا | فغاں کی بہت اور کہا ای خدا
ابد تک یہ بوسے رہیں گے یادگار | چلا میں شکستہ جگر دل فگار
بہت رو کے بولا کہ ای اہل فوج | ہوئے تھے تمھیں میرے سامانِ اوج
میں ہوتا ہوں ناشاد تم سے جدا | ملائے مجھے پھر بھی تم سے خدا

ذرا آ کھڑے ہو مرے گرد و پیش | گلے مل کے رخصت ہوں میں سینہ ریش
یہ سنتے ہی سب کی لگی ہچکیاں | بپا ہو گیا شور محشر وہاں
غرض نیچی آنکھیں کیئے مونہہ کو موڑ | روانہ ہو اسب کو مغموم چھوڑ
دوبارہ وہ آیا دوبارہ لڑا | دوبارہ بھی اُس سے نہ کچھ بن پڑا
وہ آغاز میں فکر کرتا اگر | تو کیوں ہوتا انجام میں نوحہ گر
نہ کرتا اگر نوشِ جام انا | تو کاہے کو نخوت کی ملتی سزا
اگر وہ نہ پیتا شرابِ خودی | تو کیوں ہوتا یہ حال اے احمدی

پند چہارم

اس میں سلطان بلبن کی معدلت گستری، جفاکشی اور بیدار مغزی کی ایک مختصر تاریخی داستان بیان کر کے عیش و عشرت اور غفلت شعاری کی مذمت کی ہے۔ قصہ کی ابتدا میں سلطان ناصر الدین کی خدا پرستی اور عدل و انصاف کا تذکرہ کر کے یہ بتایا ہے کہ اُس نے سلطنت کا تمام کاروبار اپنے نیک نہاد وزیر بلبن کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا اور خود فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور سال میں دو قرآن مجید لکھ کر اور اُن کو ہدیہ کر کے اُس کی قیمت سے اپنا گزارہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیگم نے شبانہ روز کی محنت و مشقت سے عاجز ہو کر بادشاہ سے فریاد کی کہ

پکاتی ہوں خود اپنے ہاتھوں طعام | میں تنہا ہوں اور اس قدر مجھ پہ کام
کوئی خادمہ کاش ہوتی اگر | تو آرام سے میری ہوتی بسر
کہا شاہ نے سُن تو آرام جاں | ہیں اور تو کوئی دن کے ہیں مہماں
ہمیشہ یہاں ہم کو رہنا نہیں | شکایت عبث پھر ہی ناز نیں
میری تیری یوہیں گزر جائے گی | یہاں جو کرے گی وہاں پائے گی

جزا تجھ کو جنت میں دے گا خدا   مکدر نہ ہو اپنے دل میں ذرا

اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد سلطان کے اوصاف و محامد کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہو کہ وہ اپنے ذاتی مصارف کے لیے سلطنت کے خزانہ کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ ہمیشہ رفاہ عام کے کاموں میں مصروف رہتا مسجدیں، پل، اور مہمان سرائے تعمیر کرتا اور رعایا و فوج کی دلجوئی کرتا اور اُن کو خوش رکھتا تھا اس کے بعد بتایا ہو کہ جب سلطان نے وفات پائی اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو ارکین دولت نے وزیر سلطنت بلبن کو ۶۶۴ھ میں تاج و تخت کا مالک قرار دیا۔ بلبن میں کیا خوبیاں تھیں جو اُمرائے دولت کی نظر انتخاب اُس پر پڑی؟ فرماتے ہیں:۔

ذکی تھا بہت بلبن اور بخت کار   حلیم و سخن فہم و صاحب وقار

اراذل کو مجلس میں دیتا نہ بار   سبک سر سے ملتا نہ تھا زینہار

شریفوں کا جویا تھا اور قدرداں   رذیلوں سے نافر تھا اور بدگماں

سفیہوں کو اعلیٰ نہ دیتا تھا کام   نہ کرتا تھا کم ظرف سے وہ کلام

علانیہ کہتا تھا وہ پاک باز   کہ لازم ہی ہر شخص میں امتیاز

کوئی جبکہ کم ظرف کو منہ لگائے   پسندیدہ لوگوں سے آنکھیں چرائے

تو بے شبہ اُس کی ہو ایسی مثال   بدل لے کوئی جیسے کمّل سے شال

پھر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

نہ سمجھے کوئی اس سے ہرگز یہ بات   کہ مغرور و بدخو تھا یہ نیک ذات

نہیں! بلکہ یہ آخر اندیش تھا   سزاوار تحسین و خوش کیش تھا

رعایت نہ کرتا تھا انصاف میں   نہ تھا زنگ اُس کے دلِ صاف میں

پڑ عدل کرتا تھا اجلاس جب   تو ملحوظ رکھتا تھا احکام رب

یہاں تھے برابر شریف و رذیل   نہ ملحوظ تھا حکم ربِ جلیل

نہ اعلیٰ کا پاس اور نہ ادنیٰ پہ جبر
برابر تھے یاں اہلِ اسلام و گبر

سفر میں جو دریا پہ ہوتا گزر
تو کرتا عجب کام یہ نامور

امیروں کے ہاتھوں میں دیکر عصا
یہ کہتا تھا تم سب بنو رہنما

مریضوں کو اول کرا دو عبور
اور ان کو کیا تعب نے جن کو چور

ضعیفوں کو عورات و اطفال کو
حفاظت سے پہونچا چکو تب چلو

اس کے بعد سلطان کی مذہبی پابندی اور جفاکشی و صید افگنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

طبیعت میں تھا اُس کی شوقِ شکار
بہت میرِ صید اور بہت باز دار

ملازم تھے بہر شکار طیور
ہر ایک اُن میں تھا باریابِ حضور

وہ دستانے ہاتھوں پہ اپنے چڑھائے
لئے باز شب کو سحر تک جگائے

کسی سمت شکرا تو باشہ کہیں
نہیں اور ایسا تماشہ کہیں

کسی جا سیہ گوش چیتا کہیں
نہ بچے کیسے پھر صید جیتا کہیں

شکار افگنی کو جو ہوتا سوار
سوار اس کے رہتے جلو میں ہزار

یہ سب تھے اسی کام کے واسطے
کہ جب شاہ صید افگنی کو چلے

یہ سب اُس کے ہمراہ حاضر رہیں
کوئی صید بھاگے تو جانے نہ دیں

زمستاں میں وقت سحر شہریار
پئے صید ہوتا ہمیشہ سوار

دیواڑی تلک دشت میں گھوم گھام
پھر آتا تھا دہلی کو ہنگام شام

ہلاکو کو پہونچی جو شہ کی خبر
یہ صحرا نوردی مسا و سحر

کہا اُس نے بلبن ہے ایک پختہ کار
نہیں اُس کو زنہار شوقِ شکار

بہانہ ہے صید افگنی کے وہ شاہ
جفاکش بناتا ہے فوج و سپاہ

یہ سب مشغلے اس لیئے ہیں اُسے
کہ محنت کشی کا وہ عادی رہے

نہ وہ سست ہے خود نہ کاہل ہے فوج
فرو ہونے پائے نہ دریا کی موج

ہلاکو کی بلبن نے سن گفتگو
کہا اہل دربار کے روبرو

کہ بے شک جو خود ملک داری کرے
وہی ایسی باتیں بیاں کر سکے

وہی ملک گیروں کے سمجھے چلن
برتتا ہو جو ملک گیری کے فن

بہت کر چکا جب وہ نظم و نسق
رہا ہر طرح سے طرفدارِ حق

فراہم کیا خوب سامان جنگ
جسے دیکھ ہو عقلِ تیمور دنگ

سلطان کے اسی طرح کے بعض اور اوصاف بیان کر کے ولی عہد کا ذکر کیا ہی

ولی عہد تھا اُس کا سلطان نام
سپہرِ لیاقت کا ماہ تمام

دلِ شہ کو اُس سے تھی دل بستگی
وہ تھا باذل و خوش لقا و سخی

گرامی طبیعت مہذب پسند
قوی بازو و مادر و ہوشمند

عقیل اور عقیلوں کی صحبت سے شوق
غرض کچھ عجب صاحبِ شوق و ذوق

اسے اچھے لوگوں سے صحبت رہی
فریدِ جہاں خسرو دہلوی

اسی شاہزادے کی خدمت میں تھا
نہ ہوتا تھا زنہار اُس سے جدا

سُنی اُس نے سعدی کی جب شہرتیں
تو بھیجے کئی شخص شیراز میں

لکھا شوق صحبت کا خط میں بیاں
کہ ای شیخ معجز بیاں خوش زباں

سوئے کشورِ ہند تکلیف کر
ہمیں اپنی صحبت سے کر بہرہ ور

مگر شیخ نے عذرِ پیری کیا
نہایت ادب سے یہ پاسخ لکھا

کہ ای شاہزادے معلے ہمم
کیا تو نے عاصی پہ بذل و کرم

مجھے خاکِ شیراز سے اُنس ہی
بڑھاپے میں مجھ کو نہ تکلیف دے

زباں میں وہ پہلی طلاقت نہیں
سفر کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں

ہلال اب ہی سعدی جو پہلے تھا بدر
غنیمت ہی خسرو اگر کیجئے قدر

گلستاں روانہ کی اور بوستاں
نہیں اس سے بہتر تھا کچھ ارمغاں

کتابیں ملیں شاہزادہ کو جب | ہوئی اُس کی حالت نہایت طرب
یہ تھا خوش ارادہ توانا جواں | ولیکن نہ پائی اجل سے اماں
بہت جینے پایا نہ یہ خوش دماغ | مقدر میں بلبن کے تھا اُس کا داغ
مغل نے جو کی تاخت پنجاب پر | مقابل ہوا جاکے یہ پُر ہنر
مگر اُس لڑائی میں مارا گیا | نہ اعدا کے ہاتھوں سے جانبر ہوا
ہوا شاہزادہ کا بلبن کو غم | رہا مدتوں وہ رہین الم
کیا آخر کار صبر و شکیب | مگرشہ کے بھی تھے اب ایام شیب
زیادہ تھا اسّی سے سلطاں کا سن | قویٰ میں تنزل تھا رات اور دن
تکلف سے کرتا تھا گو کار و بار | توانائی اُس میں نہ تھی زینہار
کہاں تک کرے کوئی دنیا کے کام | یہ ہی سچ کہ ہے ذات حق کو دوام
اجل ایسے عادل کو بھی آگئی | اُٹھا سوئے فردوس پہنچا گئی
بجا گرچہ بلبن کا کوس رحیل | مگر اُس کا زندہ ہے ذکر جمیل
کرے جو کوئی بادشہ ایسے کار | تو دونوں جہاں میں ہے تاجدار
یہ فرزانہ کہہ کر ہوا جب خموش | ہوا اُس سے رخصت نصیحت نیوش
یہ ہے احمدی لطف مرگ و حیات | خوشا وہ جو رکھتا ہو ایسے صفات

۳۰۶۱۳۰۷

پند پنجم

یہ پند نہایت سودمند اور قیمتی خیالات سے لبریز ہے۔ اس میں انسانی ترقی کے اصول بیان کیے ہیں اور واقعات سے ثابت کیا ہے کہ بغیر بلند ہمتی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے کوئی انسان دُنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتا اس کارگاہ ہستی میں صرف وہی لوگ عروج و ترقی حاصل کرتے ہیں جو "موقع" کو ضایع نہیں کرتے اور حصول عزت و جاہ کے لیے

MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH M.U.

دلیری کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں کیونکہ یہ دُنیا کش مکش و مسابقت کی جگہ ہے۔ اس میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو دوسروں سے زیادہ دلیر و بلند ہمت ہو اور اپنے زور بازو سے دوسروں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھ جائے۔

اُردو فارسی شاعری میں اگرچہ اخلاقی مضامین بھی بہ کثرت بیان کئے گئے ہیں لیکن اخلاق کے اس پہلو پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ہماری شاعری میں جو اخلاقی مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر حلم و تواضع، جود و سخا، قناعت و خودداری، عدل و انصاف، امانت و دیانت وغیرہ کے متعلق ہیں۔ ہندوستان کے آخر دَور میں جبکہ مسلمانوں کے مردانہ اوصاف زائل ہو گئے تھے زیادہ تر اسی قسم کے مضامین اخلاقی شاعری کا عنصر تھے۔ چونکہ یہ زمانہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال اور مایوسی و ناکامی کا تھا اس لئے شاعری پر بھی وہی اثر پڑا اور دنیا کی بے ثباتی عزلت اور قناعت کے مضامین نظموں میں لکھے جانے لگے اور یہی خیالات تمام قوم میں پھیل گئے

لکھنؤ کے ایک اُستاد (شاعر) کا لطیفہ ہے کہ جب اُن کا ایک شاگرد کسب معاش کے لئے باہر جانے لگا اور رخصتی ملاقات کے لئے اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے فرمایا: "میاں وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا" شاگرد نے اُستاد کا یہ فقرہ حیرت سے سُنا اُستاد کا مطلب جو اُنھوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا تھا کہ جب یہاں اور وہاں ایک ہی خدا ہے تو باہر جانے کی ضرورت کیا اگر قسمت میں ہے تو یہاں بھی ملے گا۔ باہر جانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہاں کوئی دوسرا خدا ہے جو تم کو دے گا شاگرد نے بھی اسی زمانہ کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی یہ برمحل فقرہ اُن پر اثر کر گیا، کمر کھول دی اور پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے۔

اس واقعہ کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ مسلمان جو نیابت الٰہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور جن کو خلیفۃ اللہ فی الارض کا منصب حاصل تھا اور جنھوں نے دن رات کے سفروں سے بحر و بر میں تلاطم پیدا کر دیا تھا سمندروں کو عبور کرتے تھے۔ بے آب و گیاہ میدانوں میں سفر

کرتے تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر مردانہ وار چڑھتے تھے، مقام عبرت ہی کہ آخر میں اُن کی پست ہمتی کی نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ خانہ نشینی اور عزلت گزینی سب سے بڑا وصف سمجھا جاتا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہ حالات اس کے مقتضی ہیں کہ اخلاقی شاعری میں اصلاح و تغیر کیا جائے اور اُس میں ایسے مضامین بیان کیے جائیں جو قوم کے مردانہ و شریفانہ اوصاف کو جنبش میں لائیں اور مردہ دلی کو دور کریں تاکہ وہ شاعری جو اب تک اس بنا پر بدنام ہی کہ اُس میں گل و بلبل کے افسانوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، قوم کے لیے مفید و کارآمد بن جائے چنانچہ پند پنجم کے جستہ جستہ مقامات جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اُن سے اندازہ ہوگا کہ اس میں کیسے بلند و مردانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہی۔ تمہیدی مطالب کے بعد فرماتے ہیں:-

یہ ہی پنجمی بند کا اب بیان
بگوش تمنا سُن اے نوجوان

کوئی اچھا موقعہ اگر ہاتھ آئے
تو کاہل نہ ہو تا کہ ہاتھوں سے جائے

سدا دورِ دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

حصول تمنا کا گر ہو یقیں
تو پھر کاہلی اُس میں اچھی نہیں

بلا سے اگر سختیاں پیش آئیں
جو ہیں مرد وہ جھیلتے ہیں بلائیں

علو ہمتی سے ہے تری راہ بر
خرد تیری مشعل ہی پیش نظر

ارادہ ہی ہمراہ تیرے رفیق
اگر فضل یزداں ہو تیرا شفیق

تو بے شک تو ہو جائے گا کامیاب
کرے گا نہ تجھ کو مقدر خراب

کھٹکتا ہو گلچیں کو گر خوفِ خار
تو حاصل نہ ہو پھول اُسے زینہار

لرز جائے جو سُن کے ظلمت کی بات
تو پہنچے کہاں تا بہ آبِ حیات

کرے سعی کامل جو ہو کر نڈر
وہی اپنے مقصد سے ہو بہرہ ور

ولیکن ضروری یہ شرط اُس میں ہی
خرد جس میں تحریک کوشش کرے

اُسی آرزو میں عرق ریز ہو	نہ ہر لغو خواہش پہ تو تیز ہو
مگر جس تمنا میں کوشش کرے	ہی لازم قدم پھر نہ پیچھے دھرے
نشانہ پہ پہنچے جو کوشش کا تیر	تو ہو بخت و دولت تری دستگیر

جس روانی، سلاست، اور برجستگی کے ساتھ یہ ولولہ انگیز خیالات بیان کیے گئے ہیں وہ محتاج بیان نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آب صافی بے روک ٹوک بہتا چلا آتا ہے۔ اس کے بعد فرزانہ کی زبان سے شہنشاہ بابر کی اولوالعزمی کا قصہ بیان کرکے گویا ان اوصاف کا مجسمہ تیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

عمر شیخ فرماں دہ اندجاں	گیا چھوڑ کر جب یہ فانی جہاں
ملا شاہ بابر کو تخت اور تاج	لگا کرنے شاہی کے سب کام کاج
نمایاں تھا چہرہ سے فر شہی	عیاں ناصیہ سے فروغ مہی
اولوالعزم عالی ہمم خندہ رو	دلیرانہ ہر امر میں گفتگو
جو پیش آئے سختی ہراساں نہ ہو	کسی چیز سے بھی وہ ترساں نہ ہو
جو اس کے برجا ہر اک کام میں	نہ اول میں خائف نہ انجام میں
ہوا جبکہ وہ رونق افزائے تخت	موافق ہوا اُس سے اقبال و بخت
لڑا جس سے اس پر مظفر ہوا	کسی دن نہ ناکام پیچھے ہٹا
ہوا جس مخالف سے وہ کینہ خواہ	گیا اُس کو برباد و خوار و تباہ
اتارا اپنے اعدا کو خنجر کے گھاٹ	ہوا اُس کا توراں سے دل اُچاٹ
بدخشاں میں خسرو سے وہ آلڑا	مقدر سے یاں اُس کا نیزہ گڑا
جو لی میان سے تیغ نصرت قریں	بدخشاں ہوا اُس کے زیر نگیں
چلا وہاں سے کابل کو یہ جنگ جو	رکھی تیغ نے ہر جگہ آبرو
من اللہ نصرت رہی جس کے ساتھ	ملا کون سکتا ہے پھر اُس سے ہاتھ

اسی طرح بابر کی بہت سی فتوحات کا ذکر کرکے ہندوستان کی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر اس مشہور و معروف تاریخی معرکہ کا منظر دکھایا ہے جس نے پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودی کی قسمت کا فیصلہ کرکے بابر کو ہندوستان کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔ فرماتے ہیں۔

ہوا پانی پت جا کے پیکار و جنگ ۔۔۔ لگی چلنے توپ او تفنگ و خدنگ
ادھر شاہ ہند اور اُدھر میرزا ۔۔۔ مقابل ہوئے دونوں میداں میں آ
پیاپے ہوئے حملے با یک دگر ۔۔۔ اِدھر پیل جنگی اُدھر شیر نر
پٹھان اس طرف سے بڑھے جیسے شیر ۔۔۔ اُدھر سے بڑھے ترک جنگی دلیر
سروہی ادھر سے کھنچی آب دار ۔۔۔ اُدھر سے ہوا تیر سینہ کے پار
کبھی مل کے باہم کٹاری چلی ۔۔۔ کبھی بار شمشیر کاری چلی
ادھر ہاتھ مونچھوں پہ لب پر فغاں ۔۔۔ اُدھر منہ میں دابے ہوئے داڑھیاں
اِدھر پیچ پگڑی کے گرتے تھے کھل ۔۔۔ اُدھر اہل عمامہ کرتے تھے غل
کیا وہ شجاعان جنگی نے کار ۔۔۔ کہ اب تک زمانہ میں ہے یادگار
جدھر دیکھیے آن کی آن میں ۔۔۔ گری لاش پہ لاش میدان میں

اس کے بعد فلاں کو وہ پیکر کے حملے کی تصویر کھینچی ہے اور آخر میں بابر کی فتح اور دہلی میں اس کے داخلہ کی کیفیت اور انعام و اکرام کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس لڑائی کا ذکر کیا ہے جو بابر اور رانا سانگا سے ہوئی۔ رانا اس شان و شوکت سے آیا تھا کہ اس کی کثرت سپاہ نے بابر کی فوج کو خوف زدہ کر دیا اور وہ جنگ سے جان چرانے لگی لیکن بادشاہ کی پر جوش تقریر نے اُن میں ہمت پیدا کی اور وہ آمادہ جنگ ہو گئے چنانچہ

ہوئے جبکہ جنگ آوراں گرم کیں ۔۔۔ دہلنے لگی ہر طرف سے زمیں
ہوئی خنجر خوں فشاں کی چمک ۔۔۔ اُڑا رنگِ رخسارِ تُرکِ فلک

بہم لشکروں کی جو جنبش ہوئی بہت جنگ میں کد وکاوش ہوئی

آخرکار یہ نتیجہ نکلا کہ رانا سانگا نے راہ فرار اختیار کی اور

وہ بھاگا تو پسپا ہوئی اُس کی فوج پھر آخر کو اُلٹی سمندر کی موج
ہوئی فتح حاصل تو بابر جھکا گرا سجدے میں اور کہا ای خدا
کیا تونے یاں بھی مجھے فتح مند تو ناصر مرا میں ترا مستمند
میں کیا خاک اور کیا ہی میری زباں کروں شکر تیرا میں رب جہاں

نظم کے خاتمہ پر نتیجہ نکالا ہی۔

ملا اُس کو موقع مقدر سے نیک نہ کی اُس نے تاخیر بھی اُس میں لیک
اگر اس میں تاخیر کرتا یہ شاہ تو ہوتا کہاں ہند کا بادشاہ
نہ ہوتا اگر مستعد یہ عقیل تو کس طرح اس درجہ ہوتا جلیل
جو رہتا یہ مصروفِ کم ہمتی تو کب ہند کی اُس کو ملتی شہی
حکیمِ سخن گو یہ کہہ چپ رہا نصیحت پذیر اُس سے رخصت ہوا
نئی احمدی عاقلوں کی ہی چال ہمیشہ ہی اُن کی نظر بر مآل

پند ششم

فیروز چھٹے روز پھر پہونچتا ہی اور فرزانہ اُس کو حسب معمول نصیحت آمیز کلمات سے مخاطب کرتا ہی اور یہ تعلیم دیتا ہی کہ تو سلطنت کو ایک خاندان خیال کر اور اس خاندان کے ہر فرد کے ساتھ مہربانی سے پیش آ اور ایسے قوانین نافذ کر جن سے نظم مملکت عمدہ پیمانہ پر قایم ہو جائے اور ملک کی اصلاح ہو مگر تنہا اپنی رائے پر اعتماد نہ کر بلکہ بہترین اشخاص کو اپنا مشیر و ہمراز بنا تا کہ اگر تجھ کو لغزش ہو تو وہ متنبہ کرے اور تو افراط تفریط سے محفوظ رہے کیونکہ

کوئی کیسا ہی ہو فلاطوں خرد
سمجھتا ہو پہلے سے ہر نیک و بد

بدل بھی ہو پاکیزہ اُس کا خیال
جہاں میں نہ رکھتا ہو اپنی مثال

بھی خواہ خلق و خوش اندیش ہو
عقیل و حکیم و جفاکیش ہو

حواس اُس کے روشن ہوں ہر کام میں
نہ اول میں بھولے نہ انجام میں

مگر پھر بھی یہ بات ممکن نہیں
کہ دھوکا نہ کھائے کبھی وہ کہیں

اسی وجہ عامل کو یہ ہے ضرور
کہ ہوں جمع پاس اُس کے اہل شعور

مگر اُن میں ہر اک کو ہو اختیار
کہ فہم غلط کے نہ ہوں پاس دار

وہ ایسے نہ ہوں تجھ سے جو خوف کھائیں
کہے جو تو وہ ہاں میں ہاں سب ملائیں

کہا شاہزادہ نے فرزانہ سے
کہ حضرت مجھے ایک خلش اس میں ہے

خرد مند سے ہو بُرا کیسے کار
بھلا جو کہ ہو کہاں ہوشیار

کرے کیوں نہ ہر کام کو با کمال
بھلا کیسے ممدوح ہے اعتدال

کہا اُس نے اے خوش عمل ہوشیار
مجھے تیری دانش پہ آتا ہے پیار

میں اب تیرے پاسخ میں بہر مثال
سناؤں تجھے لائے کرگس کا حال

کہ وہ خیر خواہ خلائق رہا
مگر حد سے گزرا تو مطعون ہوا

وہ گو قابل مدح و تعریف تھا
ولیکن نہ الزام سے بچ سکا

اس کے بعد لائے کرگس کا قصہ بیان کیا ہے کہ اُس نے اسپارٹا میں عجیب و غریب قوانین نافذ کئے جن میں اکثر تو نہایت مفید تھے لیکن بعض قوانین میں وہ حد اعتدال سے گزر گیا تھا مثلاً یہ کہ ملک میں جو بچے کمزور پیدا ہوں یا ناقص القویٰ ہوں وہ مار ڈالے جائیں صرف مضبوط و توانا بچے زندہ رکھے جائیں جن کی پرورش اور نگرانی سرکاری طور پر ہو۔ اس طرح اور دلچسپ قوانین اور ملکی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ لائے کرگس نے امارت وغیرہ کا امتیاز اُٹھا دیا تھا چنانچہ تمام آراضی لوگوں سے لیکر برابر برابر تقسیم

کردی۔ گھروں میں کھانا پکنے کا طریقہ موقوف کر دیا اور سرکاری طور پر کھانے کا انتظام کیا تمام لوگوں کو باہر کھانا کھلایا جاتا تھا اور سب کی غذا یکساں ہوتی تھی۔ غذا سادہ اور مقوی ہوتی تھی، تکلف موقوف کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی ترغیب دی جاتی تھی کہ لوگ خوب سیر ہو کر کھانا کھائیں۔ لڑکوں کو جفاکشی و اطاعت شعاری کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ وہ مضبوط بنیں اور تکالیف کو ہنسی خوشی سے برداشت کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

سکھاتے تھے لڑکوں کو کر کے خطاب
کہ ہر بات کا مختصر ہو جواب

بعجز و فصاحت بحلم و حیا
مگر اس میں مطلب ہو پورا ادا

سکھاتے تھے قانون جنگ و وغا
یہی لائے کرگس کا تھا مدعا

شب و روز اس کو یہی تھا خیال
کہ میری رعایا ہو آسودہ حال

فن جنگ دن رات حاصل کرے
ہر اک خود کو اس فن میں کامل کرے

سکھانے جو منظور تھے داؤ گھات
طبیعت سے سوجھی عجب اس کو بات

دیا حکم سب لڑکے باغوں کو جائیں
جو ہوں کھانے پینے کی چیزیں چرائیں

کریں چوری میں ظاہر ایسے ہنر
کہ ہرگز کسی کو نہ ہووے خبر

مکانات عالی میں جایا کریں
سلیقہ سے چیزیں چرایا کریں

کوئی پکڑا جاتا جو اس کام میں
نہ ہوتی سزا ایسے الزام میں

پر اس جرم میں اس کو ہوتی سزا
کہ کیوں اپنی غفلت سے پکڑا گیا

کیا کیوں نہ دانش سے صرف ہنر
کھلا کیوں ترا حال ہر ایک پر

کسی طفل نے لومڑی ایک چرا
لیا اس کو دامن کے نیچے چھپا

کسی پر نہ ظاہر ہوا اس کا حال
مگر لومڑی ہوتی ہے بد خصال

تہہ دامن اس کا کیا پیٹ چاک
کیا دم کے دم میں ہم آغوش خاک

نہ آئی مگر اُس کے ماتھے پہ چیں | زباں سے کرے اُف یہ ممکن نہیں
فنا ہوگیا دم نہ مارا مگر | گیا جی سے ہمت نہ ہارا مگر

اسی طرح اور بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اُس نے تمام قوم میں ایک جنگی روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ

یہ تھا اہلِ کشور کو ارشادِ عام | پڑے جب کبھی جنگ کا تم کو کام
تو میداں میں ایسے جماؤ قدم | کہ بدخواہ کا بند ہوجائے دم
تمھیں دیکھ کر گرم کین و عتاب | دلیروں کا زہرہ ہو ہیبت سے آب
کرے تیرا آکر جو پہلو فگار | تو سمجھو کہ مہماں ہوا ہم کنار
کشاکش کمانوں کی باہم جو پاؤ | تو تھامے رہو دل کو چلا نہ جاؤ
جہاں تک بڑھا جائے آگے بڑھو | دگرنہ وہیں جم رہو مر ہٹو
ولیکن نہ پیچھے ہٹاؤ قدم | تمھارے رہے جب تلک دم میں دم
یہ ارشاد ایسا موثر ہوا | کہ سب کے دلوں میں یہی بس گیا
کہ مرنا بھلا پیچھے ہٹنا زبوں | کوئی شخص نامرد کہلائے کیوں
کبھی بے اجل کوئی مرتا نہیں | جو ہے مرد دشمن سے ڈرتا نہیں

اس کے بعد چند واقعات بیان کرکے بتایا ہے کہ لائے کرگس کے قوانین نے تمام قوم میں کیسی اسپرٹ پیدا کر دی تھی یعنی

کیا اُس نے ہر شخص کو پہلواں | دلیر و توانا و جنگی جواں
ہوا سارے یونان پر رعب و داب | یہ کشور جہاں میں ہوئی لاجواب

اسی سلسلہ میں یہ بتایا ہے کہ بعض قوانین میں وہ جادۂ اعتدال سے بڑھ گیا تھا اس لیے مورد الزام ہوا

وہ اندازہ سے بڑھ نہ جاتا اگر | تو بے شک تھا بے مثل و دانا بشر

پند ہفتم

ساتویں روز شاہزادہ پھر فرزانہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نصیحت کا طالب ہوتا ہے

فرزانہ کہتا ہے کہ ؎

تجھے ایک نصیحت سناتا ہوں میں ۔۔۔ بہت راہ سیدھی بتاتا ہوں میں
سمجھ مملکت ہے خدا کی عطا ۔۔۔ یہ دولت ہے بخشیدۂ کبریا
نہیں تو ہے اُس کا فقط مستحق ۔۔۔ ہر ایک اہل کشور کا ہے اُس میں حق
مگر تیرا سب میں ہے رتبہ رفیع ۔۔۔ تو حاکم ہے اور سب ہیں تیرے مطیع
سوا تیرے ہیں جس قدر جوق جوق ۔۔۔ کر ان کے لئے نظم حفظ حقوق
مگر نظم میں ان کی بھی رائے لے ۔۔۔ کہ تا اپنے دل کی ہر ایک کہہ سکے
کرے تو مقرر قوانین جو ۔۔۔ تو بہتر یہ ہے مشورت سب سے ہو
پسند آئے جو سب کو وہ کام کر ۔۔۔ رہے تا زمانے میں تو نامور
کسی کو زیادہ نہ دے اختیار ۔۔۔ کہ آزردہ ہوں اُس سے اہل دیار
کسی کے نہ رکھ دین وملت سے کام ۔۔۔ کہ یہ فعل ہے مخرب انتظام
جو ہے جس کا دین اُس میں وہ شاد ہے ۔۔۔ تجھے کیا ترا ملک آباد ہے

اسی طرح نصائح بیان کرنے کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کا تذکرہ کرکے اُن کے شاندار عہد حکومت کے کارنامے بڑی آب وتاب سے بیان کیے ہیں چنانچہ جو لڑائیاں ملکہ کے زمانہ میں ہوئیں اُن کو سلسلہ وار بیان کیا ہے۔ جنگ روم وروس میں انگریزوں نے ترکوں کی جو مدد کی اُس کو بھی لکھا ہے اور خوب لکھا ہے جو رزمیہ بیان کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے غدر ۱۸۵۷ء کا بھی مختصر طور پہ تذکرہ کیا ہے اس کے بعد ملکہ معظمہ کے عہد کی تمدنی وملکی ترقیوں کا حال بیان کیا ہے مثلاً

مفید خلایق ہوئے خوب کار | رہیں گے جو صدہا برس یادگار
ہوا ڈاک کا اس قدر انتظام | کہ ہی جس سے واقف ہر اک خاص و عام
بنی ایسی عمدہ بڑی دوربیں | ہوا جس سے قرب فلک چوں زمیں
ہوئے بعضے سیار ثابت نئے | جو پہلوں کی دانش سے بچ گئے
نہایت بنے عمدہ عمدہ جہاز | سمندر میں پائیں گے عمر دراز
یہ جاری ہوا جابجا تار برق | کہ قاصد کا کرنے لگی کار برق
رُکا بحر میں اور نہ بر میں رُکا | نہ یہ خشک میں اور نہ تر میں رُکا

اس کے بعد برطانیہ کے طرز حکومت و آئین سلطنت کو نہایت حُسن و خوبی سے بیان کیا ہی مثلاً فرماتے ہیں۔

عجب سلطنت ہی یہ اے نیک پی | نہ شخصی نہ نوعی، نہ جمہوری ہی
وہ ہوتی ہی شخصی جہاں بادشاہ | کرے چاہے جو کچھ سفید و سیاہ
نہ مارے کوئی اُس کی مرضی میں دم | وہ چاہے کرے عدل چاہے ستم
وہ نوعی ہی جس جا پہ اہل دول | بہم مل کے کرتے ہوں نظم و عمل
وہ جمہوری ہی جس جگہ سب عوام | کریں جاری مل جل کے ہر انتظام
مرکّب ہی ان سب سے یہ سلطنت | بڑی اس کی ہی قدر اور منزلت
بھلا کیوں نہ ہو اس شہی کو قیام | جہاں ایسا بے مثل ہو انتظام

اس کے بعد پارلیمنٹ کی کیفیت، اور امرا و وزرا کے درجوں اور مرتبوں کو بیان کیا ہی اور انگریزی حکومت کے طرز حکمرانی کی خوبیاں بیان کرکے اُن اصلاحات کا ذکر کیا ہی جو اس زمانہ میں عمل میں آئیں مثلاً بردہ فروشی اور ستّی کی رسم کا موقوف ہونا۔

اسی بند ہفتم پر کتاب کا خاتمہ ہی جہاں فاضل مصنف نے مختصر طور پر اپنا اور اپنے وطن کا تذکرہ کرکے دعا پر کتاب کو ختم کر دیا ہی۔ پوری کتاب پڑھنے سے دل پر عجیب

اخلاقی اثر پڑتا ہی اور یہ اندازہ ہوتا ہی کہ شاعری سے کیسے مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

(محمد احید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ اے۔ پرنٹر)